

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_188324

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۲۸
کتاب ۹۰۰

Acc No. 19507

عبدالمطین

غالب

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. 228 Accession No. 19502

Author ~~محمد~~ محمد اللطيف 19507

Title نواب مترجم معین الدین قری

This book should be returned on or before the date last marked below.

غالب

حیات اور اردو شاعری کی تنقیدی تحسین
مُصَنَّفہ

ڈاکٹر سیّد عبد اللطیف پی ایچ ڈی (لندن)

پروفیسر انگریزی ادب جامعہ عثمانیہ مصنف وی انٹرنیشنل
آف انگلش لٹریچر آن اردو لٹریچر

مُتَرَجِمہ

سیّد معین الدین قریشی ام اے (عثمانیہ)
ناشر

جہاں گیر بک ڈپو۔ کھاری باؤلی۔ دہلی
تیسری روپیہ پچاس پیسے

فہرست مضامین

صفحہ	مضامین	باب
۳	دیباچہ	۱
۹	تمہید	باب اول
۲۲	مواد اور اس کی فراہمی	باب دوم
۳۵	مواد اور اس کی تاریخی ترتیب	باب سوم
۵۲	مسائل غالب	باب چہارم
۷۰	غالب کا زاویہ نگاہ زندگی	باب پنجم
۹۶	پر عظمت شاعری	باب ششم
	غالب کی شاعری	باب ہفتم
		ضمیمہ (۱)
		ضمیمہ (۲)
		اشاریہ

دو سہ

علمی دنیا کے سامنے اس چھوٹی ٹیسی کتاب کو پیش کرتے ہوئے بطور اظہار حال دو ایک باتیں عرض کر دینی ضروری ہیں۔

جب سے کہ غالب پر میرے چند مضامین (جو یہاں باب اول، چہارم اور پنجم کے تحت درج ہیں) ہندوستانی جرائد میں شائع ہوئے ہیں، اردو داں طبقوں میں ایک سنسنی سی پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض حضرات ایسے بھی موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے ظنیات اور غیر معتدل مدحت سرائی کے خلاف ایک حق بجانب صدائے احتجاج لے اصل کتاب بنہ بان انگریزی ستمبر ۱۹۳۸ء میں طبع ہوئی تھی۔

بلندگی ہے لیکن اور احباب مجھ سے اس بنا پر ناراض ہیں کہ اس کتاب کے لکھنے سے میرا مقصد اس ہستی کو بالارادہ مطعون کرنا یا اس کا تہنگنا ہے جس کو وہ دنیا کے عظیم الشان شاعروں میں شمار کرتے رہے ہیں ان حضرات نے میری مکمل تصنیف کے مطالعہ اور اصل نتائج کی جانچ سے پہلے یہ رائے قائم فرمائی ہے! سنا ہے کہ بعض حضرات یہ بھی بوجہ چھتے ہیں کہ آخر مجھے غالب پر قلم اٹھانے کا کیا حق حاصل ہے کیونکہ ان کی رائے میں، میں نے اردو کے دامن میں پرورش نہیں پائی بلکہ جنوبی ہند کی محض ایک غیر تربیت یافتہ بولی، دکنی کا آغوش یافتہ ہوں میں جانتا ہوں کہ وہ حضرات جو میرے اس حق کا سوال اٹھائے ہیں اپنے مضامین میں اردو زبان و ادب کے کسی نہ کسی پہلو کی تائید میں، گریس اور لٹل کے اقتباس پر اقتباس بے تکلفی کے ساتھ دیے جاتے ہیں اور اس کو باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مجھے یقین کامل ہے کہ ان میں نہ تو گریس اور نہ لٹل ازراہ فروت و اخلاق بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کم از کم اس بولی کے آغوش یافتہ ہیں جس میں میں نے آنکھیں کھولیں۔

اردو ادبی تنقید ان دنوں اسی قسم کے نقادوں کی تختہ مشق

بنی ہوئی ہے جو دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مقدس ویڈیوں کے
 علاوہ ہندوستان میں اگر کوئی الہامی کتاب ہے تو وہ دیوان غالبؔ
 اس زمانے سے جس میں سے چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا ہے
 مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا، والا ترانہ تفسن وجود میں
 آیا، دیوانہ دار افراد کی یہ بہادری روز بروز بڑھتی ہی گئی اور ادبی
 رائے زنی کے احساس تناظر کا گلا گھونٹتی رہی۔ اپنی چار دیواری
 میں بیٹھ کر یہ حضرات اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اردو ادب
 ابھی عالم عنفوان میں ہے وہ ابھی عبوری دور میں ہے اور شباب کی
 منزل مقصود کی طرف جا رہا ہے لیکن عنفوان سے شباب اور شباب
 سے پختگی تک پہنچنا دور کی بات ہے۔ غالب جیسے غزل گو شعر اجو
 اپنی زمین پر آسمان ہی بن کر کیوں نہ چمکے ہوں آتے اور جاتے
 رہیں گے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ غالب پر اردو شاعری کبھی ختم
 نہیں ہو سکتی۔ ابھی ہمیں ایسے بلند پایہ شاعر اور نوع انسانی کے
 نگسار مجنبن پیدا کرنے ہیں جو زندگی کے اس احساس ہم آہنگی کو
 جس پر میں نے اس کتاب کے چھٹے باب میں خصوصیت کے
 ساتھ زور دیا ہے، جو ہر اعلیٰ شاعری کا لازمی عنصر ہے ہم میں
 بسا دیں گے اور ذہن انسانی کو « حسین پیکروں کی جلوہ

گاہ " بنا دیں گے۔

یہ ایک ادبی احتیاج ہے جس کی اہمیت کو واضح کرنے کی اس حقیر کتاب میں کوشش کی گئی ہے۔ کاش میرے افراد قوم اس پر غور فرمائیں۔

» میں کچھ دور کا منظر دیکھنا نہیں چاہتا،

» ایک ہی قدم میرے لئے کافی ہے «

میں نے بعض لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا ہے کہ مشرقی شاعری کو مغربی معیار پر جانچنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا میں نے غالب کی تحسین میں واقعی کوئی اجنبی معیاروں سے کام لیا ہے، کیا درحقیقت ایسے کوئی معیار موجود بھی ہیں؟ زندگی اور خصوصاً انسانی زندگی سارے عالم میں اصلاً ایک ہی ہے۔ البتہ اس کا اظہار ہر مرد اور عورت میں انفرادی طور پر بدلتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ جس قسم کی روح ہوگی اظہار بھی اسی نوعیت کا ہوگا۔ بالخصوص سرودی شاعری میں۔ یہی وہ روح ہے جو ہر مرد یا عورت کے احساس و کیفیت کے پس پردہ کار فرما رہتی ہے قبائے ظاہری یعنی الفاظ کے رسمی پردہ کو چاک کر دیکئے (اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہر زبان کی موند و نیت کے لحاظ سے قوانین لفظیات کا سوال پیدا ہوتا ہے) تو آپ کو

وہ روح نظر آجائے گی جو ظہور کے لئے بے تاب تھی۔ یہ روح ایک سرچشمہ سے جنم لیتی ہے۔ اور ہر فرد میں اس کے اپنے ظرف نور کے لحاظ سے چمکتی ہے۔ یہی وہ ظرف ہے جس سے جمالی ظہور کے میدان میں ایک شخص کا درجہ متعین کیا جاتا ہے۔ خواہ اس شخص کا تعلق مشرق سے ہو یا مغرب سے۔

آخر میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ باب سوم کی تیاری میں جو غزلیات غالب کی تاریخی ترتیب سے بحث کرتا ہے۔ میں نے دیوان غالب کے اس نسخہ سے بہت مدد حاصل کی جو ۱۳۲۷ھ ۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ سرکار بھوپال نے ازراہ فیاضی مجھے یہ نسخہ مستعار عنایت فرمایا تھا۔ میں اس موقع پر

لے یہ نسخہ دیوان غالب کی تاریخ و ارتدوین میں میرے لئے بہت کار آمد ثابت ہوا۔ دیوان مذکور اس وقت زیر طبع ہے اور تقریباً شائع ہو جائیگا۔

سرکار موصوف کا سانس گزار ہوں۔ نواب سر حیدر نواز
 جنگ بہادر کا دلی شکر یہ بھی مجھ پر فرض ہے، جن کے حسن توسط
 سے مجھے یہ نسخہ حیدر آباد میں دستیاب ہوا۔

جامعہ عثمانیہ۔ حیدر آباد دکن
 ۱۹۲۸ عیسوی
 سید عبداللطیف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

باب اول

مہتید

اُردو دیوان غالب جس کو خود غالب نے مرتب کیا تھا کوئی اٹھارہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ بظاہر یہ ایک مختصر سا سرمایہ ہے جو اگر دوسرے بلند پایہ شعرا کے کلام کے مقابل رکھا جائے تو اور بھی کم مقدار و معنوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود موجودہ نسل نے غالب کو جو درجہ دے رکھا

ہے وہ کسی اور اردو شاعر کو نصیب نہیں۔

غالب کے سن وفات یعنی ۱۸۶۹ء سے اب تک کئی تنقید نگاروں نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اردو شاعری میں اس کا کما حصہ ہے بعضوں نے محض رسمی طریقہ پر کام کیا اور ایسے الفاظ میں "طفلانہ حیرت" کا اظہار کیا جو "شرمندہ معنی" ہوئے یا شاعر کے اسلوب اور طرز سخن کی لفظی موثکافیوں میں گم ہو گئے۔ کسی نے بھی اس کی روح میں سما جانے اور اس کے شاعرانہ احساس و فکر اور تخیل کی خصوصیت کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔ تنقید نگاروں کے اس گروہ نے زیادہ تر ان لوگوں کو پرچایا جن کی تعلیم ایک حد تک قدیم طرز پر ہوئی ہے اور جن کے ذوق حسن شناسی پر مغربی ادبیات کی پرچھائیاں نہیں پڑیں مگر گفتی کے چند افراد ایسے بھی ہیں جنہوں نے ان رسمی تنقید نگاروں کی بہ نسبت زیادہ وسیع مقاصد کے ساتھ اپنا کام شروع کیا۔ مولانا الطاف حسین حالی اور ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ان حضرات کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا کہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کا کام زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے اور کلام غالب کا محقق کبھی کبھی مدد اور رہنمائی اور بسا اوقات ہی بنائی رائے کیلئے ان کا دامن پکڑتا ہے۔

حالی اور بجنوری غالب کے سمجھنے میں اپنے علم و فضل کو تو خوب

سمجھا گئے لیکن خود غالب کے ذہن و کمال کی مکمل تصویر نہ کھینچ سکے۔ ڈاکٹر
 بجنوری کی ”محاسن کلام غالب“ حاکمی کی ”یادگار غالب“ کے کئی سال بعد
 شائع ہوئی۔ بجنوری مرحوم مشرق و مغرب دونوں کے ادبی نصب العین
 سے واقف تھے اس لئے وہ غالباً حافی سے زیادہ اس بات کی اہمیت رکھتے
 تھے کہ جدید علمی اصول پر غالب کا حق تحسین ادا کریں لیکن ”محاسن“ کے
 مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی قوت فیصلہ کمال جوش
 و عقیدت کا نشانہ ہو گئی۔ بھلا وہ نقاد پڑھنے والے کے دل میں کیا اعتماد پیدا
 کر سکتا ہے جو اپنی کتاب کا آغاز ہی اس حیرت انگیز قول سے کرتا
 ہے ”ہندوستان کی دو اہمائی کتابیں ہیں۔ مقدس وید اور
 اردو دیوان غالب۔“

اس طرح کے قول فیصلہ سے فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ نقاد کو
 اصول تناظر کا کوئی احترام نہیں۔ یہ نقش ہر اس شخص پر بیٹھتا ہے جو بجنوری کی
 پر جوش گردش قلم کا آخر وقت تک ساتھ دیتا ہے۔ غالب جو بھی سہی سب سے
 اول ایک غزل گو شاعر تھا اس کے تغزل کی خصوصیات معلوم کر نیکیے لئے
 دوسروں سے مقابلہ کرنا ایسا ہی ناگزیر سمجھا گیا تو صحیح طریقہ یہ تھا کہ اسی
 میدان کے ادب شعراء کو لے لیا جاتا نہ یہ کہ اپنے ہیر و کی خاطر مغربی حسن
 کاری اور فلسفہ و ادب کے ان تمام مشاہیر کا خاکہ اڑا یا جائے جن سے

وہ واقفیت رکھتے ہیں جیسے رے قبیل، روئیس ورجیل، اریاسٹو، گیلے، مام بیر، میلارے، رمبو، میاد موزل دی مویان، ویر لیں میٹر لنک، ایلسن، ٹیکسیر، وردس ورتہ، کانٹ، ہیگل، ایسائینوزا، بیکن، یارکلے، ڈارون، والس، لاپلاس، اسپنسر، منڈل، دیزمن، لاج ہرشل، فغنے اور برگ ساں۔

ناموں کی شاندار صرف آرائی نے غالب کی خصوصیات ذہن و کمال کے سمجھنے میں مدد دینے کے بجائے اگر کچھ کیا تو صرف اسی قدر کہ ان کو اور بھی دہند لکے میں ڈالی دیا شاعر کے نمایاں محاسن و معائب کو دکھا کر اس کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر نہ سکی کو شمش ہی نہیں کی اسکے علاوہ جرمین اور فرانسسیسی اقتباسات سے موازنہ یا مقابلہ کر کے جب غالب کی خوبیاں ہی دکھانا مقصود تھا تو قارئین کے افادہ کے لئے ان کا ترجمہ بھی ضروری تھا کیونکہ قارئین کی غالب تعداد ان زبانوں سے ناواقف ہے۔ جنوری کے اس طویل مطالعہ کے بعد بھی ایک شخص اسی مجمع میں مبتلا رہتا ہے کہ آخر غالب کی شاعرانہ عظمت کا ملائیس چیز پر ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۳۔ تعریف راقم الحروف "ادب انگریزی کا افسانہ ادب پر"

فرانسس گرگام ملٹیڈ۔ لندن ۱۹۳۴ء۔

عالی کی یادگار غالب گونبتاً ضعیف ہے لیکن اس میں ادعائی شان بہت کم پائی جاتی ہے۔ بجنوری کی طرح وہ ڈرامہ نویسوں، رزمینگاروں اور فلسفیوں کے جبرمٹ میں دیوانہ وار نہیں بھٹکتے بلکہ ایک خاص قابل فہم مسلک اختیار کرتے ہیں۔

اپنے دیباچہ میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ غالب کو سمجھنے کے دو طریقے ان کے ذہن میں آتے ہیں ایک طریقہ تو یہ ہے کہ (۱) ان کے اصناف کلام سے ایک معتد بہ حصہ نقل کیا جاتا۔ (۲) جو کلام نقل کیا جاتا اس کی لفظی اور معنوی خوبیاں نراکتیں اور بارے یکیاں بیان کی جاتیں شعرا کے جس طبقہ میں مرزا کو جگہ دی جانی چاہئے اس طبقہ کے شاعروں کے کلام سے مرزا کے کلام کا موازنہ کیا جاتا ان کی تغزل سے مرزا کی تغزل کو قصیدہ سے قصیدہ کو اور اسی طرح ہر صنف سے اسی صنف کو ٹکرا یا جاتا۔

عالی اس کو عمدہ طریقہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس بنا پر مثال جاتے ہیں کہ یہ طریقہ دشوار گزار اور نکلے زمانہ کے لئے غیر مفید ہے وہ یہ بیان کر نیکی زحمت نہیں گوارا کرتے کہ آخر یہ طریقہ کس لئے دشوار گزار اور غیر مفید ہے۔

ایک نقاد کو اور خاص کر اس شخص کو جو کوئی حقیقت بیان کرنا اور عام مذاق کی اصلاح کے لئے کوئی پیغام سنانا چاہتا ہے اپنے

دل کی بات بتا دینی لازمی ہے۔ ساری خدائی اگر اس کو نہ سمجھ سکے تو کیا مضائقہ خدا کے چند بندے بھی کان دہر کر سن لیں تو دل کی مراد پوری ہو گئی۔ کوئی نصب العین یا تو ایک آن کی بیساختہ لہر ہوتا ہے یا مسلسل کاوشوں کا نتیجہ وہ ایک طرح کی مخلوق ہے اور اسی لئے اس کی پیدائش ضروری ہے۔ دبا دبا کر اس کا گلا گھونٹنا گناہ کا ایجاب کرنا اور انسانی فطمتوں سے انکار کرتا ہے بہر حال حالی کا "عمدہ طریقہ" کوئی ایسا عمدہ نہیں معلوم ہوتا "ہر صنف کے اشعار کا بہترین طریقہ نقل کر دینا، لفظی اور معنوی خوبیاں نزاکتیں اور باریکیاں بیان کرنا، شعرا کے جس طبقہ میں مرزا کو جگہ دینی چاہئے اس طبقہ کے شاعروں کے کلام سے مرزا کے کلام کا موازنہ کرنا، ان کی غزل سے غزل کو قصیدہ سے قصیدہ کو اور اسی طرح ہر صنف سے اسی صنف کو ٹکرانا، حقیقت میں مضمون کو توڑنا ہے اس طریقہ سے شاعر کی جتنی جاگتی تصویر جلوہ گر نہیں ہوتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ غالب کے "پرزے الہائے جاہے ہیں" اس سے کوئی مربوط اور مسلسل اثر پیدا نہیں ہوتا حالی کا دوسرا طریقہ جو انہوں نے یادگار غالب میں اختیار کیا ہے موضوع کو تین حصوں میں منقسم کر دیتا ہے۔ پہلے حصہ میں غالب کے واقعات زندگی ہیں۔ دوسرے میں نظم و نثر کے انتخاب ہیں جبکہ موازنہ ایران کے مسلم الثبوت شعراء سے کیا گیا ہے

تیسرے کے متعلق یہ بتلایا گیا ہے کہ اس میں غالب کی حیات، شاعری اور اصول پر ایک مختصر سا تبصرہ ہے۔

راقم الحروف نے نہایت ہی کھلے دل سے اس طریقہ کے نتائج کی جانچ کی اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ عالی کے اس عمدہ طریقہ کے مقابلہ میں جس کو انہوں نے خوش قسمتی سے ترک کر دیا اس قدر غیر علمی نہیں لیکن یہ بھی اپنا نشانِ منزلی کھو بیٹھتا ہے۔ پہلے ہی حصہ کو لیجئے جس میں غالب کے واقعات زندگی کو بیان کر نیکی کو شمش کی گئی ہے اس میں زندگی کے واقعات نہ تو تاریخ وار بیان کئے گئے ہیں اور نہ ترقی وار۔ ان سے غالب کے ذہن و کمال کے نشوونما اور ارتقا پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ تاریخوں کے بیان کرنے میں کسی ایک سنہ کی پابندی نہیں کی گئی۔ ہمیں سنہ عیسوی لکھ دیا گئے ہے اور کہیں سنہ ہجری ان کے بیان کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

(۱) ولادت (۱۲۱۲ھ) اور خاندان (۲) ابتدائی تعلیم و تہ بیت (۳) سفر کلکتہ (جو ۴۰ سال کی عمر میں پیش آیا) تاریخ ندرہ (۴) وظیفہ لکھنؤ تاریخ ندرہ (۵) زبان کی دو مشکلات (۶) واپسی کا تاریخ کی فائنل پروفیسری مرزا کی خدمت میں پیش کی گئی ۱۸۲۲ء، قید ۱۸۲۴ء (۸) غالب کا تعلق چغتیا درباری مورخ کے ۱۸۲۶ء (۹) اصلاح شعر بہادر شاہ (۱۰) سفر کلکتہ

کا ایک واقعہ (۱۱) اولاد (۱۲) مرثیہ عارف (۱۳) غدر (۱۴) وظیفہ رام پور
 (۱۵) قاطع برہان (۱۶) مرزا کی استعداد علمی۔ عربی، فارسی، عروض،
 تصوف، تاریخ، اور شعر خوانی وغیرہ (۱۷) اخلاق (۱۸) مروت
 (۱۹) عالی حوصلگی (۲۰) حافظ (۲۱) شعر فنی (۲۲) حسن بیان (۲۳)
 خودداری (۲۴) خوراک (۲۵) آموں کی رغبت (۲۶) اسلام کا یقین
 (۲۷) بہادر شاہ اور مذہب تشیع (۲۸) انکسار (۲۹) سلامتی طبع
 (۳۰) داد سخن (۳۱) انصاف (۳۲) تقریظ لکھنے کا ڈھنگ (۳۳)
 صداقت پسندی (۳۴) ناقدر دانی کی شکایت (۳۵) عجز کا اقرار
 (۳۶) ہجو سے احتراز (۳۷) خانگی تعلقات (۳۸) وفات۔

غالب کی زندگی کا یہ مرقع پڑھنے والے کے دل پر کوئی متعہ
 اور مربوط نقش نہیں بیٹھا سکتا۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں غالب کی شاعری کا اندازہ
 لگایا گیا ہے لیکن بحث یہاں بھی فرداً فرداً ہر جنم سے کی گئی ہے چند
 صفحات اس کے لئے وقف کر دئے گئے ہیں کہ جتہ جتہ اشعار
 سے اس کی خصوصیات کلام ظاہر کی جائیں جو حالی کی رائے
 میں یہ ہیں۔ تازگی مضمون، طنزنگی خیال، جدت تشبیہ و
 استعارہ، معمولی الفاظ میں لطیف خیالات کو ظاہر کرنے کی

قدرت اور فخر و مباہات جو اس عصر کا ایک عام رنگ تھا۔ اس کے بعد حالی چلتے چلتے رک جاتے ہیں چنانچہ خود فرماتے ہیں :-

”اگرچہ مرزا کی اردو شاعری پر بحث کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ گنجائش باقی ہے لیکن چونکہ لوگوں کو ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اس لئے ہم اس بحث کو یہاں ختم کرتے ہیں اور صرف اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ مرزا کے دیوان ریختہ میں جس قدر اشعار سرسری نظر میں ممتاز معلوم ہوں وہ بطور انتخاب کے یہاں نقل کر دئے جائیں۔۔۔۔۔ اور جہاں ضرورت ہوگی اس شعر کے معنی بھی بتلائیں گے اور کہیں کہیں محاسن شعری کے متعلق بھی اشارہ کیا جائیگا۔“

اس اچلتے انداز میں غالب کا سب سے مقبول سوانح نگار اس مسئلہ کی تمام الجھنوں سے اپنا دامن چھڑا لیتا ہے حتیٰ کہ یادگار کے آخری حصہ میں بھی جس کو وہ اپنی تنصیف کی جان سمجھتے ہیں خود غالب کی جان سخن پر متوجہ نہ ہو سکے۔

حالی کی اس قدر محنت و کاوش کے بعد بھی پڑھنے والا راضی رہے گا غالب کو نہیں پاسکتا کیونکہ بے ربط جزوی مباحث اور غالب کے دل کے

لکھڑوں کو الگ الگ بتانے سے اس کے شاعرانہ کمال کی صحیح تصویر ہمارے آنکھوں کے سامنے نہیں آسکتی۔

”یادگار غالب“ کے قارئین کو یاد ہو گا کہ عالی نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مشاہیر شعرائے فارس سے غالب کا موازنہ نہ کر کے اس کے پایہ شاعری کا تعین کرتا ان کی تنصیف کا نمایاں پہلو ہو گا۔ لیکن یہ مسئلہ جب علمی طور پر ان کے سامنے آتا ہے تو دامن بچا کر نکل جاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

”اگرچہ مقتدائے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ ان سب لوگوں کی غزلوں سے کیا جاتا جن کی غزل پر مرزا نے اپنی غزل بلکہ تمام شاعری کی بنیاد رکھی یعنی نظیری، عرفی، ظہوری، طالب، اور اسیر وغیرہ لیکن اس مختصر کتاب میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ (یہ یاد رہے کہ یادگار غالب تقریباً ۳۹۱ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔)

نیز عام طبائع کو اس قسم کی تدقیقات سے کوئی دل بستگی بھی نہیں معلوم ہوتی اس لئے یہاں مرزا کی صرف دو غزلوں کا مقابلہ نظیری اور ظہوری کی غزلوں سے کیا جاتا ہے۔ نظیری کی جو مشہور غزل پانختہ است و بلاخفتہ است موجود ہیں، کیا جاتا ہے۔ نظیری کی جو مشہور غزل پانختہ است و بلاخفتہ است ہے مرزا صاحب نے بھی اس پر غزل لکھی ہے نظیری کی غزل نو بہت کی ہے

جس میں سے ایک شعر نپہ چا نہیں گیا اور مرزا کی غزل بارہ بیت کی ہے اس لئے مرزا کی غزل میں سے بھی اول صرف آٹھ بیتن لی جائیں گی تاکہ ٹھیک ٹھیک موازنہ ہو سکے۔

غضب ہے کہ غالب کے شاعرانہ کمال کا اندازہ ان آٹھ اشعار سے کیا جاتا ہے جو کسی اندرونی جذبہ سے سچین ہو کر نہیں لکھے گئے بلکہ تقلید و فرمائش اور ذہنی مشق کا نتیجہ ہیں۔ اس موازنہ کی ایک عجیب بات یہ ہے کہ مقابلہ کے تمام اشعار میں شاید ہی کوئی شعر ہم مضمون نکل آئیں بجز وریف و قافیہ کے سوا کوئی چیز ان میں مشترک نہیں پائی جاتی۔

عالی و بجنوری دونوں کے طرز تنقید میں ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ ایک آدھ شعر سے وہ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ غالب ہیئتِ دہاں اور فلسفی، واعظ اور عاشق سبھی کچھ تھا۔

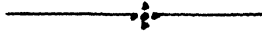
ایک اور نقاد ڈاکٹر سید محمود بیسراٹ لائیں بھی یہی ارجمان بدرجہ اتم پایا جاتا ہے جو بدایونی نسخہ کے دیباچہ میں غالب کو ہندوستانی قومیت کا اوتار بنا دیتے ہیں۔ اس طرز کی تنقیدوں سے اردو داں طبقہ میں ایک قسم کی بدذوقی پیدا ہو چلی ہے۔ یہ بات اس لئے زیادہ قابل افسوس ہے کہ پہلی روشنی کے افسراد میں یہ مذاق اس قدر رچا ہوا نہیں ہے جس قدر کہ جدید علمی مرکزوں میں پایا جاتا ہے جہاں اردو ادب

کی تحقیق و تدقیق سے بے پروائی برتی جاتی ہے اور معلم و متعلم زیادہ ترہ ادبوں کے (جیسے حالی و مجنوری) پڑھائے ہوئے سبق کو دہراتے رہتے ہیں اگر ہماری یونیورسٹیوں میں بطرز جدید غالب کا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کی بھی جاتی ہے تو نقادان فن کے لئے سخن شناسی سے زیادہ یہ امر پیش نظر ہوتا ہے کہ شاعر کے دستار سخن پہ اپنے اپنے لواحد طرے لگائیں۔

غالب پرستی کی لیے اب اس درجہ بڑھ چلی ہے کہ اردو ادب کی خاطر غالب کے ذہن و کمال کو صحیح طور پر جاننے کی کوشش (اگر ممکن ہو تو متفقہ طور پر) از بس ضروری ہے۔

یہ کام نہایت مشکل ہے۔ غالب کے واقعات زندگی منضبط حالت میں موجود نہیں۔ مکاتیب جس سے تقریباً تمام مواد دستیاب ہوا تاریخ و امر تب نہیں حالانکہ کئی ہندوستانی جامعات کی اعلیٰ جماعتوں میں وہ داخل درس ہیں ان میں بہت سے خطوط ایسے بھی ہیں جن پہ کوئی تاریخ درج نہیں۔ دیوان سے جس کو غالب نے مرتب کیا اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ کون سی غزل کب اور کس اصول میں لکھی گئی ان حالات میں غالب کا مطالعہ بہت ہی دشوار

اور کٹھن ہو جاتا ہے پھر بھی اگر قوت فیصلہ سے کام لیا جائے تو عجیب
 نہیں کہ موجودہ نسل غالب کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ سکے۔



باب دوم

مواد اور اسکی فراہمی

کلام غالب کے محقق کا سب سے پہلا کام مواد کی فراہمی ہے مواد عموماً دو قسم کا ہوتا ہے "ماخذ" اور "رہنما" "ماخذ" یا تو مستقل اور معین ہوتے ہیں جیسے کسی صاحب قلم کی تصنیفات، یا اضافی جن سے اس کے زیر غور کا ناموں پر روشنی پڑتی ہے جیسے مصنف کے عہد یا اس کے بعد کی تحریرات اور زبانی روایتیں۔ "رہنما" کی بھی دو قسمیں ہیں پہلی قسم میں ان مختلف اصناف ادب کی تاریخیں داخل ہیں جن میں مصنف نے عموماً طبع آزمائی کی ہو نیز اس قومی تہذیب کی تاریخیں جن کے زیر اثر مصنف کی نشوونما ہوئی۔ "رہنما" کی دوسری قسم جو ہر شناسی کے گروہ جیسے تاریخ جاہلیات اور ادبی تنقید کے وہ اصول سمجھاتی ہے جو ادبی طور کا مذاق رکھنے والی اقوام میں عہد بہ عہد بنتے رہے ہیں۔

شاعری

اب سوال یہ ہے کہ کلام غالب کے مطالعہ کے لئے کس قسم کا مواد ہماری دسترس میں ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے ہماری نظر دیوان غالب پر پڑتی ہے جس کو خود غالب نے اپنے اصلی دیوان سے انتخاب کر کے مرتب کیا اور اس کی زندگی ہی میں شائع ہوا۔ اصل دیوان اب کہاں ہے اور یہ انتخاب کب کیا گیا اس کا پتہ نہ تو غالب کے مطبوعہ خطبہ سے چلتا ہے اور نہ اس کے کسی سوانح نگار یا نقاد سے۔ خود غالب کے یہاں اپنے دیوان کا کوئی مکمل نسخہ موجود نہیں تھا۔ البتہ اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اس کے ایک دوست نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں اس کا کلام وقتاً فوقتاً جمع ہوتا رہتا ہے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کے ایک شہزادہ نے اپنے لئے اس کی ایک کاپی تیار کروائی تھی لہذا یہ امر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو جب انتخاب کلام کی ضرورت پیش آئی ہوگی تو اس نے انہی دو نسخوں میں سے کسی ایک کی طرف رجوع کیا ہوگا۔ یہ نسخے اگر واقعاً اب موجود ہیں تو ان کا پتہ لگانا سمجھتے

دشوار ہے۔ اُن کے متعلق غالب کا تو یہی بیان ہے کہ وہ ہنگامہ عذر میں تلف ہو گئے۔ یہ ٹھہری نہیں معلوم کیا جاسکتا کہ انتخاب کا پہلا نسخہ کہاں ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ ۱۸۵۵ء میں منتخبہ دیوان کا ایک نسخہ خود غالب نے نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے لئے خاص طور پر تیار کرایا تھا اور عجب نہیں کہ یہی سب سے پہلا نسخہ ہو۔ اس انتخاب کی بھی کوئی ذاتی کاپی غالب کے یہاں موجود نہیں تھی۔ کیونکہ غدر کے بعد اس کے ایک دوست ممتاز علی کو عظیم الدین نامی ایک شخص نے منتخبہ دیوان کے شائع کہ انیکا خیال پیدا ہوا تو اس کے لئے غالب کو ضیاء الدین خاں کے پاس کے ایک نسخہ سے نقل لینی پڑی۔ غالب کا اصلی منتخبہ کلام چونکہ غدر میں ضائع ہو چکا تھا اس لئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ نسخہ بھی اسی رام پوری نسخہ کی ایک نقل ہوگا۔ موجودہ مواد سے اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ آیا عظیم الدین نے یہ دیوان شائع کیا بھی یا نہیں بہر حال یہ یقینی ہے کہ ۱۸۶۲ء میں احمدیہ پریس دہلی نے اس کا ایک ادیشن شائع کیا۔ اور بہت ممکن ہے کہ دوران طباعت میں خود غالب نے اس کے پروف صحیح کئے ہوں

۱۔ اردوئے معلیٰ کیمپی پریس لاہور ۱۹۶۹ء - ۲۔ اردوئے معلیٰ۔ کیمپی پریس لاہور ۱۹۶۲ء

۳۔ دیوان غالب نفاذی پریس بدایون ۱۹۶۳ء دیباچہ اشاعت دوم

بہر حال غالب کے منتخبہ دیوان کی سب سے پہلی اشاعت یہی معلوم ہوتی ہے اور بعد کی تمام اشاعتیں اسی کی نقلیں۔

اس طرح محقق کے لئے یہی رام پوری نسخہ غالب کے اردو کلام کی ایک مستند کتاب آخریں، کا حکم رکھتا ہے جس میں شاعر "یاران نکتہ دال" کو مصلانے عام "وے رہا ہے۔ اس کے ساتھ محقق کو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اصلی کتاب کی کون سی چیزیں اس نے قلم زد کر دیں تاکہ وہ اس کی شاعری پر ایک جامع نظر ڈال سکے۔

اس کے لئے محقق کو تمام وکمال بھوپالی نسخہ پر تکیہ کرنا پڑے گا جو کہا جاتا ہے کہ فوج دار محمد خان بھوپال کے لئے ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں لکھا گیا تھا۔ اس وقت غالب کی عمر صرف ۲۴ سال کی تھی۔ یہ نسخہ کتب خانہ حمید یہ بھوپال میں محفوظ ہے۔ جس کی نقل ڈاکٹر عبد الرحمن بنجوری کے مقدمہ محاسن کلام غالب کے ساتھ آگرہ سے شائع ہوئی ہے اس اڈیشن میں جو نسخہ حمید یہ کے نام سے موسوم ہے

۱۔ اس ضمن میں ملاحظہ ہو مصنف، بعنوان "دیوان غالب قلمی ۱۲۳۷ھ

مسلم ریویو کلکتہ نمبر۔ ۱۹۲۹ء جس کا ترجمہ مسٹر سید محمد۔ ایم۔ اے۔ مولف ارباب اردو نے
مبذکتہ حمید آباد کے جلد ۲ شماره ۶ میں شائع کیا ہے۔ ۲۔ سن اشاعت درج نہیں ہے۔

سکتے ہیں کہ اس نسخہ میں ۱۸۳۲ء تک کا کلام موجود ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ اس زمانہ کے سارے کلام پر حاوی ہو۔

یہ معلوم کرینے کے لئے کہ نتیجہ دیوان کی ترتیب سے پہلے کون سا کلام قلم زد ہوتا رہا بھوپال اور رامپور کے نسخوں کا مقابلہ ضروری ہے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ ۱۸۲۱ء کے قبل کا کچھ کلام ایسا ہے جو بھوپالی نسخہ کے متن میں تو موجود ہے لیکن ۱۸۵۹ء کے رام پوری نسخہ میں نہیں پایا جاتا تو ایسے کلام کو ایک علیحدہ عنوان کے تحت جمع کر لینا چاہئے یہ وہ کلام ہوگا جس کو غالب نے آگے چل کر اس بناء پر خارج کر دیا کہ وہ اس کے شایان شان نہیں اس

لے بدایونی نسخہ کے مرتب مسٹر نظامی بدایونی تیسری اشاعت کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس کی تیاری کے وقت ان کے ہاں دیوان غالب کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا جس کو شاعر نے ۱۸۲۸ء (۱۲۴۷ھ) میں مرتب کیا تھا۔ اس نسخہ کو حاصل کرنے کی میں نے کوشش کی لیکن وہ بارور نہیں ہوئی۔ نظامی صاحب کا ارشاد ہے کہ وہ نسخہ مفقود ہے۔ بہر حال اگر یہ پھر دستیاب ہو جائے اور اصلی ثابت ہو تو کلام کی مزید ترتیب میں بڑی مدد ملے گی۔ موصوف کی اصل عبارت کے لئے اس کتاب کا منیہ نمبر ملاحظہ ہو۔

کلام سے غالب کے ابتدائی دس سال (۱۸۱۱ء تا ۱۸۳۱ء) کے طرز سخن کا حال معلوم ہوگا جو بعد میں یا تو بالکل بے خارج کر دیا گیا یا اس میں ترمیم و اصلاح کی گئی۔

دوسرا مقابلہ شدنی حصہ کلام وہ ہے جو ۱۸۳۱ء اور ۱۸۳۶ء کے درمیان موزوں ہوتا رہا اور جو بھوپالی نسخہ کے حاشیہ پر درج ہے۔ ان میں سے جو اشعار رامپوری نسخہ میں حذف کر دیئے گئے ان کے لئے حذف شدہ اشعار کا ایک اور علیحدہ عنوان قائم ہوگا۔

رامپوری نسخہ کے ان اشعار کو جو بھوپالی نسخہ میں نہیں پائے جاتے درحقیقت ۱۸۳۶ء تا ۱۸۵۱ء کے دور سے منسوب کرنا چاہئے۔ یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ رامپوری نسخہ کی ترتیب کے وقت اس دور کے کون سے اشعار حذف کر دیئے گئے کیونکہ دیوان کا اصلی نسخہ اب ناپید ہے۔ یہ غالب کی چھٹلی عمر کا زمانہ تھا اس لئے قیاس یہی چاہتا ہے کہ اس موقع پر بہت فقور حصہ خارج کیا گیا ہوگا۔ محقق کو اگر غالب کی مجموعی تحقیق منظور ہو اور عالی اور بخوری کی طرح صرف اپنی پسند کے اشعار پر اندازہ لگانا کافی نہیں سمجھتا ہے تو اس کو کلام غالب کے دو حصہ کرنے پڑیں گے پہلے میں وہ اشعار آئیں گے جو حذف کر دیئے گئے اور دوسرے ان اشعار پر مشتمل ہوگا جو آخر تک برقرار رہے۔ عجب نہیں کہ غالب کا اور کلام ابھی پردہ

گم نامی میں پڑا ہو یہ اگر ہاتھ لگ جائے تو اس سے وہ مطلق ماخذ مکمل ہو جائیگی جو کلام غالب کے مطالعہ کے لئے ضروری ہیں۔

نثر

غالب کی اردو نثر جس سے اس وقت ہمارا قریبی تعلق ہے زیادہ تر ان خطوط پر مشتمل ہے جو اس نے اپنے احباب کو لکھے لیکن ہمیں اس کے فارسی کے نثری کارناموں کو جن میں فارسی مکاتیب بھی شامل ہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ان سے اس کی ذہنی قابلیتوں اور واقعات زندگی پر روشنی پڑتی ہے خطوط غالب کا پہلا مجموعہ اس کی وفات کے سال اردوئے معلیٰ کے نام سے شائع ہوا۔ بعد میں ان خطوط کی کئی اشاعتیں طبع ہوئیں اور ہر اشاعت میں نئے نئے خطوط شامل ہوتے رہے۔ سب سے بڑا مجموعہ ۱۹۲۶ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

ان خطوط سے سوانح غالب کا معتد بہ مواد حاصل ہوتا ہے۔ غالب

۱۰ دیباچہ اردوئے معلیٰ از میر مہدی مجروح جو ۱۹۲۶ء کے لاہور واپس تبصرہ خطوط

غالب میں بھی شائع ہوا ہے۔ مضمون و صفحہ ۲۳۴ ۱۰۰ کریمی پریس لاہور۔

عام طور پر خط و کتابت میں دوستوں سے اپنی داستان حیات بیان کر جاتا تھا جس کے منظر عام پر آنے کا خیال بھی بعض اوقات اس کے پیش نظر ہوتا تھا لیکن اس آپ بیتی میں چونکہ شاعر اندر رنگ غالب ہے اس لئے واقعات زندگی کی چھان بین اور ان کی صحت کے امتحان میں محقق کو نہایت احتیاط برتنی چاہئے۔ مثال کے طور پر اسی مسئلہ کو لیجئے کہ بلا عبدالصمد نے غالب پر اوائلی زندگی میں کیا اثر مترتب کیا۔ اس اثر کی نوعیت کے متعلق ہمارے ہاں مآلی کی شہادت موجود ہے۔ اور خود غالب ابتدائی تحریروں میں اپنے استاد کے احسانات کا اعتراف کرتا ہے۔ لیکن جب بڑی عمر کو پہنچتا ہے تو یہ کہہ کر اس احسان سے مکمل جاتا ہے کہ اس نے سب کچھ مبداء فیاض سے حاصل کیا اور مشہور امیرانی استاد صحیح وجود غاکی نہیں رکھتا تھا بلکہ ان اہل ظاہر کی نظر فریبی کے لئے عالم خیال کا تراشا ہوا ایک پیکر تھا جو کسی بے استادے کے جوہر و کمال کو نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

” مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں اور عبدالصمد ایک

۱۷ یادگار غالب۔ کربھی پریس لاہور ص ۹۹۔ ۱۸ یادگار غالب۔ کربھی پریس لاہور ص ۱۱۱

۱۹ یادگار غالب۔ کربھی پریس لاہور ص ۶۲

فرضی نام ہے چونکہ مجھ کو بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کر نیکو میں نے
فرضی استاد گڑھ لیا ہے۔»

خود ستائی جو شاعرانہ تعلیٰ کے بھیس میں ہو بھلی ضرور معلوم ہوتی ہے
بشرطیکہ اس میں واقعی کوئی لطافت و شعریت موجود ہو۔

گنجینہ معنی کا طلسم اسے سمجھئے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے
ہم سخن فہم میں غالب کے طرفدار نہیں دیکھیں کھلے کوئی اس پہرہ بنگہ پہرہ

مذکورہ بالا اشعار میں تعلیٰ کا جو رنگ جھلک رہا ہے وہ ہمارے لئے
کوئی نئی بات نہیں۔ مشرق والوں کا یہ ایک قدیم شیوہ ہے اور اس سے
عام طور پر کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا پھر بھی ہم یہ جانتے ہیں کہ آخری
شعر نے غالب کو کس طرح تکلیف میں مبتلا کر رکھا تھا ہر نوع اس قسم کی
شاعرانہ تعلیوں کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہونا چاہئے کہ حقیقت پر پردہ ڈالا
جائے اور اگر عبدالصمد والے معاملہ کی طرح ایسا کیا جائے تو محقق کو
بھی ہشیار ہونا چاہئے۔ شاعرانہ نزاکت سے ہٹ کر اس کو یہاں تاریخی
نقطہ نظر سے غور کرنا پڑیگا۔

جن ماخذ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ "مطلق" یا "معین" ماخذ ہیں
دوران تحقیق میں ان سے متعلق اور بھی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن
کا ذکر آئندہ اوراق میں موقع بموقع آئیگا ان ماخذ کے علاوہ جن سے

جانی مواد یا سماجی مواد حاصل ہوتا ہے، اور اضافی ماخذ کا انگ پتہ لگانا ہے۔ ایک صاحب کمال کو اپنے کمال کے ظاہر کرنے اور عصر حاضر پر اپنی شخصیت کا نقش بٹھانے میں بسا اوقات مروجہ مذاق کے خلاف جانا پڑتا ہے اور اس کی بات کے سمجھنے میں لوگ عموماً ٹھوکر کھاتے ہیں۔ غالب کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی اس لئے ان کی رایوں پر غور کرتے وقت ان امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اضافی ماخذوں میں ایک ماخذ ہم عصری ادب ہے۔ اس ضمن میں ہم کو اس ادب پر بھی نظر رکھنی چاہئے جو غالب کی قاطع برہان مطبوعہ ۱۲۶۷ء (۱۸۵۹ء) کے باعث وجود میں آیا یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ قاطع قاطع "موند برہان" "محرق قاطع" "ساطع برہان" کے علاوہ جن کا ذکر حالی نے کیا ہے اسی قسم کا اور ادبی سرمایہ بھی دستیاب ہو سکتا ہے یا نہیں، حالی کا خیال ہے کہ آپس کی سب دشمنی سے بالآخر اس جدلی ادب کا سلسلہ رُک گیا۔ یہ سرمایہ باوجود مشہور ثقالت و کبراہت کے شاعر کے ان ذہنی اور اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈال سکتا ہے جو خود اس کی اور تقریرات میں صاف طور نمایاں نہیں ہو سکتے۔

غالب سے جن اجاب کی خط و کتابت رہی ان کا دائرہ عامہ وسیع تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ ان خطوط کا کیا حشر ہوا؟ دہلی اور لکھنؤ کے دربار علمی جدوجہد کے مرکز تھے۔ ان مقامات کے مصنفین کی تصنیفات یا ان مصنفین کی باہمی خط و کتابت میں ممکن ہے کہ غالب کا بھی کچھ نہ کچھ ذکر آنا رہا ہو۔ کلکتہ میں غالب کی ادبی خصوصیات پر جو ناگوار بحث چھڑ گئی تھی اس نے بیچارہ کے سفر کو تلخ ہی بنا دیا تھا۔ اس بحثا بحثی میں جو ادب پیدا ہوا اس سے بھی بہت کچھ کا لیا جاسکتا ہے۔ مگھالی گلوچ اور سب و شتم سے بھرے ہوئے گمنام خطوں خاص کر قاطع برہان کی اشاعت کی وجہ سے اس کے پاس بہت آتے رہے، کیا ان خطوط کا پتہ چلایا جاسکتا ہے؟ اس کی وفات پر اخبارات میں نوٹ بھی شائع ہوئے ہوں گے کیا ان کی فراہمی ممکن ہے؟ غالب کو ہندوستانی قومیت کا اوتار بنانے کی کوشش کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت برطانیہ کی مزاج داری سے وہ بے پرواہ نہیں رہا جس شخص کی آنکھوں نے دہلی کے اُجڑنے اور بہادر شاہ جیسے مری کی جلا وطنی کے عبرتناک تماشے دیکھے اس کا قلم علم بردار ان برطانیہ کے قصیدہ خوانی

میں بھی مصروف نظر آتا ہے۔ کیا یہ قصائد ہمیں کوئی بات سمجھا سکتے ہیں؟ کیا اس حظ و کتاہت کا بھی کھوج لگایا جاسکتا ہے جو ہمارے شاعر اور حکومت برطانیہ کے نامزدوں میں ہوئی؟ اس قسم کی تمام چیزوں سے مزید ماخذ کا کام لیا جاسکتا ہے جن میں کچھ تو "مطلق" ہوں گے اور کچھ "اضافی"۔

ایک سچا محقق غالب کے مواد کو اس وقت تک ہاتھ نہیں لگا سکتا جب تک کہ وہ ضروری ساز و سامان سے آراستہ نہ ہو۔ یہ سوال کہ دنیا کے شاعروں میں غالب کا کیا درجہ ہے ادب کے مہمات مسائل سے ہے جس کے لئے سنجیدہ تحقیق علمی کی ضرورت ہے ظاہر ہے کہ یہ کام ہر بڑھے لکھے آدمی کے بس کا نہیں اس میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہر محقق کا کم سے کم یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ ادبی تنقید کے اصول اور اس قوم یا سوسائٹی کی تہذیبی تاریخ سے واقف ہو جائے جس کا غالب ایک فرد تھا۔ اس کو ان سخنوروں کی نمایاں خصوصیات شعر سے بھی واقف ہونا پڑے گا جن سے، بقول حالی اور خود غالب، اس کی غزل کوئی متاثر ہوئی مثلاً بیدل، نظیری، عرفی، ظہوری، شیخ علی حمزہ، طالب آملی، اور میر تقی۔ اس مقصد کے لئے جو فہرست تیار کی جائے گی اور جو یقیناً خاصی طویل ہوگی "رہنما" کہلا سکیگی۔

باب سوم

مواد اور اس کی تاریخی ترتیب

مطلقاً ماخذ جن کی تفصیل پچھلے باب میں آچکی ہے، تاریخی لحاظ سے مرتب ہونے ضروری ہیں۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو غالب کے ذہن و کمال کے ارتقاء کے متعلق جو بھی رائے ظاہر کی جائے گی وہ ایک ہوائی چیز ہوگی۔

حالی جیسے افراد کو جنھیں غالب سے ذاتی طور پر شرف تقرب حاصل تھا اور جو خود عالم تھے، شاعر سے ہر غزل کی ٹھیک تاریخ نہیں تو کم از کم یہ تو معلوم کر لینا چاہئے تھا کہ کون سی غزل پہلے کہی گئی اور دن ہی بعد، اس طرح تمام غزلوں کی ترتیب معلوم کی جاسکتی تھی لیکن موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ اب ہم ان کی تاریخوں کے معین کرنے کی امید ہی نہیں کر سکتے ایک بات البتہ اب بھی ہمارے بسن میں ہے کہ اس کے تمام اردو کلام کو

ارتقائی ترتیب کے لحاظ سے مختلف حصوں میں مرتب کر لیں۔

زندگی کی رفتار ترقی اس میں شک نہیں کہ روزمرہ ہی کے واقعات پر مبنی ہوتی ہے لیکن نمایاں رجحانات روز روز نہیں بدلا کرتے اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو غالب کے کلام کی ایسی تقسیم جو بلحاظ تاریخی ارتقار مختلف ادوار حیات کو ظاہر کرنے، اس کے ذہن و کمال کے ارتقاء کی تحقیق میں مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بہتر شہادت کے عدم موجودگی میں اس سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتا۔ غالب کے روزمرہ افکار و اعمال کا معلوم کرنا اگرچہ بہت سے لوگوں کی درد سہری کا باعث ہو گا لیکن یہ بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے۔ بہر حال ادبی تنقید کیلئے کام کی بات تو یہی ہے کہ اس کا ذہن کس طرح نشوونما پاتا رہا اور مختلف دوروں اور منزلوں میں اس کے جلوئے کس طرح ظاہر ہوتے رہے اسی کے مد نظر ہم ذیل میں اس کے کارناموں کی تاریخی ترتیب کا ایک ممکن طریقہ پیش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے اس کی شاعری کو لیجئے۔ خود غالب کا بیان ہے کہ پندرہ سال کی عمر سے اس نے شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے دس سال کی

کاوشیں نسخہ بھوپال کے متن میں موجود ہیں جو ۱۲۲ھ (مطابق ۱۸۲۱ء) کا لکھا ہوا ہے جبکہ غالب کی عمر چوبیس سال کی تھی۔ اس طرح یہی نسخہ ہمارا نقطہ آغاز قرار پاتا ہے۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ ۱۸۲۱ء کے بعد کا کلام ۱۲۲ھ تا ۱۲۳ھ کے درمیان بھوپالی نسخہ کے حاشیہ پر اضافہ کیا گیا۔ اس طرح اس نسخہ کے دو حصے قرار دئے جاسکتے ہیں۔ پہلے حصہ میں وہ کلام آئیگا جو متن میں موجود ہے اور دوسرا حصہ اس کلام پر مشتمل ہوگا جو حاشیہ پر درج ہے پہلا حصہ غالب کی ادبی زندگی کے ابتدائی دس سال یعنی ۱۸۱۱ء تا ۱۸۲۱ء سے متعلق ہوگا اور دوسرا ۱۸۲۱ء تا ۱۸۳۲ء سے۔

وہ کلام جو بھوپالی نسخہ میں تو نہیں پایا جاتا لیکن رام پوری نسخہ میں موجود ہے ۱۸۳۲ء تا ۱۸۵۵ء کے دور سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔

۱۸۵۵ء کے بعد بھی غالب کے شعر کہے ہوں گے لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہو سکتی کیونکہ زندگی کے آخری سال گہری شاعرانہ مصروفیت کے سازگار نہیں ہو سکتے تھے۔ "مہر نیمروز" کی تیاری نے اس کو ۱۸۵۵ء کے

ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ۲۸۔ اس کے ساتھ یادگار غالب مطبوعہ کربھی پریس لاہور ۱۹۶۲ء میں

۷۰۸ ملا کر پڑھے جہاں حاشی صاحب نے غالب کی اردو شاعری کی ابتدا کا حال لکھا ہے۔

غزل تک مصروف رکھا۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے درمیان جیسا کہ خود غالب کا بیان ہے غزل کی طرف اس کی طبیعت مائل ہی نہیں ہوئی۔

”قصیدے میں نے دو لکھے ہیں ایک اپنے مرثیہ قدیم جناب فریڈرک اڈمنٹن صاحب بہادر کی تعریف میں اور ایک جناب نیشکر می صاحب کی مدح میں ایک پچیس بیت کا اور ایک چالیس بیت کا۔ اور پھر فارسی۔ ان کو ریختہ کی غزل میں کیا چھاپو گے جانے بھی دو۔ رہیں غزلیں سابق کی وہ جو میرے ہاتھ آتی جائیں گی بھجواتا جاؤں گا۔ میاں تمہاری جان کی قسم نہ میرا اب ریختہ لکھنے تو جی چاہتا ہے نہ مجھ سے کہا جائے اس دو برس میں صرف وہ پچیس شعر بطریق قصیدہ تمہاری خاطر سے لکھے۔ بھیسے تھے سوائے اس کے اگر کوئی ریختہ کہا ہو گا تو گنہگار بلکہ فارسی غزل بھی واللہ نہیں لکھی صرف دو قصیدے لکھے ہیں۔ کیا کہوں کہ دل و دماغ کا کیا حال ہے۔“

۱۸۵۹ء کے بعد بھی غالب اردو میں نئے شعر لکھنے کی طرف مائل نظر نہیں آتا۔ اس دور کی سنجیدہ کوشش صرف اس کی فارسی مثنوی ”ابو گہر بارہ“ ہے ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء کا دور نمایاں طور پر شعر سے زیادہ نثر کا دور رہا کیونکہ اسی زمانہ میں اس کے خطوط کی زیادہ تعداد لکھی گئی۔

اردو شاعری سے جو تھوڑا بہت لگاؤ اس کو باقی رہ گیا تھا۔ وہ اس کے شاگردوں اور قدر والوں کے اشعار کی اصلاح میں ظاہر ہونا رہا۔

عمر کے آخری ایام میں جو کلام موزوں ہوا اس کا بہت کم حصہ روشنی میں آیا ہے اس دور کو ۱۸۵۶ء تا ۱۸۶۹ء سے متعلق کرنا چاہئے۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ۱۸۱۱ء تا ۱۸۲۱ء کے دور کی کئی غزلیں اور اشعار غالب نے اپنے کلام کے آخری انتخاب کے وقت تقریباً ۱۸۵۵ء میں جبکہ رامپوری نسخہ مرتب ہوا، خارج کردی تھیں۔

ایسے اشعار ضروری نہیں کہ سب سے قدیم ہوں۔ وہ اس دور کے آخری ایام سے بھی متعلق ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی یقین کے ساتھ نہیں بیان کی جاسکتی۔ بہر حال ہم ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ۱۸۱۱ء تا ۱۸۲۱ء کی پیداوار ہیں جن کو غالب نے اپنی شان سے بعید سمجھ کر خارج کر دیا تھا۔ غالب کی پختگی عمر کے رنگ سخن کو پیش نظر رکھ کر یہ بات البتہ ایک حد تک وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان میں اس کی ادبی سرگرمی کے پہلے دس

سال کی ضروریات ضرور موجود ہیں۔

پہلے دس سال کا کلام جو رامپوری نسخہ میں بہ قرار رکھا گیا ہے اس سے یا تو اس کے ابتداء کی طریقہ انظہار کے اصلی ہیجانات ظاہر ہونے میں یا شاعرانہ انظہار کی ذہنی مشق یا فرماگشتی شعر و غزل گوئی کی قابلیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ آخری دو پہلو ہم نے اس لئے پیش کئے کہ غزل گو شاعر کہ لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ذاتی احساسات ہی کا انظہار کرے جیسا کہ کتاب کے آخری باب میں بیان کیا گیا ہے۔ بہر صورت اس حصہ کلام کو غالب کے ارتقا شاعری کی پہلی منزل سمجھنا چاہئے۔ دوسرے حصہ کلام پر بھی جو بھوپالی نسخہ کے حاشیہ پر درج ہے اور جو ۱۸۲۱ء تا ۱۸۳۲ء کے دور سے منسوب کیا گیا ہے یہی صادق آتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ۔

۱۔ کلام غالب کی پہلی قسط وہ ہے جو بھوپالی نسخہ کے متن (۱۸۲۱ء

میں موجود ہے۔

۲۔ دوسری قسط ان اشعار کی ہے جو بھوپالی نسخہ کے حاشیہ پر درج

ہے اور جو ۱۸۲۲ء تا ۱۸۳۲ء کے دور پر حاوی ہیں۔

۳۔ تیسری قسط ان اشعار پر مشتمل ہوگی جو بھوپالی نسخہ میں موجود

نہیں ہیں اور صرف رام پور والے نسخہ میں پائے جاتے ہیں اس کو

اس کو ۱۸۳۳ء تا ۱۸۵۵ء سے منسوب کرنا چاہئے۔
۴۔ چوتھی قسط ۱۸۵۶ء تا ۱۸۶۹ء کے دور سے متعلق ہوگی۔ اس طرح
مختلف تدریجی ادوار حسب ذیل ہیں۔

۱۱ سال کا دور	(۱) ۱۸۱۱ء تا ۱۸۲۱ء
۱۱ سال کا دور	(۲) ۱۸۲۲ء تا ۱۸۳۲ء
۲۳ سال کا دور	(۳) ۱۸۳۳ء تا ۱۸۵۵ء
۱۴ سال کا دور	(۴) ۱۸۵۶ء تا ۱۸۶۹ء

غالب کے ذہن و کمال کے نمودار تقار کا پتہ لگانے کے لئے
محقق کو حسب ذیل ترتیب سے اس کے کلام کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔
متعلقہ دور کا وہ کلام جو رام پوری نسخہ میں متعلقہ دور کا وہ
کلام جو رام پوری نسخہ قرار دیا گیا۔
نسخہ سے خارج کر دیا گیا۔

۱۔	۱۸۱۱ء تا	۱۸۲۱ء - - - - -	تا	۱۸۲۱ء
۲۔	۱۸۲۲ء تا	۱۸۳۲ء	تا	۱۸۳۲ء
۳۔	۱۸۳۳ء تا	۱۸۵۵ء		
۴۔	۱۸۵۶ء تا	۱۸۶۹ء		

۱۸۱۱ء تا ۱۸۳۲ء کا وہ کلام جو رام پوری نسخہ میں بہ قرار رکھا
گیا اس کا مطالعہ اسی دور کے اس کلام کی روشنی میں کرنا پڑے گا

جو نسخہ مذکور میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس مطالعہ سے جو نتائج اخذ ہوں گے وہ اس کی پختگی عمر یعنی ۱۸۳۳ء تا ۱۸۵۵ء اور مابعد کے کلام کے مطالعہ کی بنیاد قرار پائیں گے۔

نثر

پہلے ذکر آچکا ہے کہ غالب کی اردو نثر زیادہ تر اس کے خطوط ہی پر مبنی ہے جو خطوط کہ شائع ہو چکے ہیں وہ ۱۸۵۲ء تا ۱۸۶۹ء کے دور پر حاوی ہیں اور اگر حالی کے بیان کو مان لیا جائے تو ان خطوط کو ۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۶ء پر بھی حاوی ہونا چاہئے۔ لیکن ان دو سال کے خطوط کا پتہ ان خطوط میں نہیں چلتا پھر بھی ممکن ہے کہ بعض وہ خط جن پر تاریخ نہیں ہے ۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۱ء کے زمانہ کے ہوں۔

یہ تمام خطوط سوانح غالب کی بعض تفصیلات کی تعین یا توضیح میں ہمارا بہت ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ محقق کی آسانی کے لئے اس باب کے آخر میں ایک نقشہ دیا گیا ہے جس میں مکتوب الیہم کے نام، خط و کتابت کی مدت اور مکاتیب کی تعداد بتلائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کل اتنے ہی خطوط تھے جو غالب نے ان لوگوں کے نام لکھے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں کے علاوہ اور کسی سے اس کی خط و کتابت نہیں رہی۔

نقشہ کے ملاحظہ سے واضح ہو گا کہ شایع شدہ خطوط کے حسب ذیل دو زمیں کئے جاسکتے ہیں۔

۱- ۱۸۵۲ تا ۱۸۵۴ ۵ سال

۲- ۱۸۵۷ تا ۱۸۵۸ ۲ سال

۳- ۱۸۵۹ تا ۱۸۶۳ ۵ سال

۴- ۱۸۶۴ تا ۱۸۶۹ ۴ سال

ان میں غالب تعداد ایسے خطوط کی ہے جن کے آخر میں اس

کا نام یا دستخط موجود ہیں لیکن بعض پر یہ نام و نشان نہیں پائے جاتے۔ محقق پر اس دوسری صنف کے خطوط کے مستند یا غیر مستند ہونے کی ضروری تحقیق لازمی ہے۔

۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۶ء کا دور غدر سے متصل پچھلے پانچ سال پر عادی ہے اس دور کے خطوط کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کی نوعیت سے ظاہر ہوگا کہ شاعر کی زندگی کے یہ سال بے معرکہ رہے۔ صرف یہی ایک واقعہ اس دور میں نمایاں نظر آتا ہے کہ بہادر شاہ کا درباری مورخ مقرر ہوتا اور ”مہر نیروز“ تصنیف کرتا ہے۔ ۱۸۵۵ء اور ۱۸۵۶ء کا زمانہ اس کی زندگی کے انتشار کا زمانہ ہے۔ غد کا طوفان اٹھا تو غالباً بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکا۔ پنشن اور خلعت کے بندھوٹے اور اسی قسم کے واقعات کا جن خطوط میں ذکر آیا ہے وہ اسی دور سے متعلق ہیں۔

وہ خطوط جن میں پنشن اور خلعت کی بجائی پر خوشی کا اظہار کیا گیا جو اردو دیوان اور کلیات اردو کی اشاعت سے متعلق ہیں اور جو دوستوں اور قدردانوں کی مالی امداد جس میں رام پور اور الور کی پنشنیں بھی شامل ہیں ا کے شکریہ میں لکھے گئے یہ سب کے سب ۱۸۵۹ء تا ۱۸۶۳ء کے دور کے ہیں۔ یہ دور مالی حیثیت سے اس کے چین و آرام کا دور تھا۔

۱۸۶۲ء تا ۱۸۶۹ء کا دور جو اس کی جو فوات پر ختم ہو جاتا ہے طویل علالت اور جسمانی تکلیف کا دور تھا۔ جو خطوط کہ زندگی کے ان آخری ایام کی

کہانی سناتے ہیں وہ سب سے آخر گروپ کے تحت آتے ہیں۔
متذکرہ بالا ترتیب کے ساتھ جو محقق، مکاتیب غالب کی تاریخی
تدوین کرنا چاہیں انہیں تاریخ زدہ خطوط کے الگ کرنے میں کوئی وقت
پیش نہیں آئے گی۔ بعض خطوں پر صرف دن یا مہینہ لکھا ہو لے اور
بعض پر تو یہ بھی نہیں ہے ایسے خطوط کی ترتیب مختلف ادوار کے تحت
کس طرح انجام پاسکتی ہے۔

اس بارہ میں صرف اندرونی شہادت ہی ہماری رہبری کر سکتی ہے۔
یہ خطوط یا تو ایسے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو بلحاظ مفہوم
کسی نہ کسی دور سے متعلق کئے جا سکتے ہیں یا وہ ایسے معمولی واقعات کو
ظاہر کرتے ہیں جو ہر مرد یا عورت کی کسی منزل حیات میں واقع ہو سکتے ہیں
آخر الذکر صورت کی یہ دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

دو کیوں صاحب ہم سے خفا ہو گئے کہ ملنا بھی چھوڑا۔ خیر میری
تقصیر معاف کرنا اور اگر ایسا ہی گناہ عظیم ہے کہ کبھی نہ بخشا
جائیکا تو وہ گناہ مجھ پر ظاہر کر دو تاکہ میں اپنے قصور پر اطلاع
پاؤں۔ برخوردار پھر میرا سنگھ تمہارے پاس پہنچتا ہے اور یہ
تمہارا دست گرفتہ ہے۔ رہتک میں تم نے اسے نوکر رکھو ادیا
تھا خیر وہاں کی صورت بگڑ گئی اب یہ غریب بہت تباہ ہے

اور امور معاش میں سمحت دل تنگ، تم ہی دست گیری کرو
تو یہ سنبھلے ورنہ اس کا نقش ہستی صوفیہ ہر سے مٹ جائیگا۔

والسلام۔

غایت کا طالب

غالب

” بندہ پور۔ آپ کا خط لکھنے سے آیا حالات معلوم ہوئے۔ یہ نہ
معلوم ہوا کہ کیا کام آپ کے سپرد ہوا ہے۔ یہ بھی لکھئے۔ چند درمیر
کمروطن میں ہوتے تو وہیں بیکاری میں گھر کی خبر کیا لیتے۔ جس طرح جب
گزرتی ہے اب بھی گزر جائیگی بلکہ تمہارا خرچ کم ہو گیا بہر حال ابھی اضافہ
کے واسطے نہ تم کھو نہ میں لکھوں۔ دو چار مہینے کام کرو اس میں اگر
بلگرام میں چھاپہ خانہ جاری ہو گیا تو استعفاء دے کر چلے جاؤ۔ یہاں
بعد چند روز اضافہ ہونا بھی تو خیر امکان سے باہر نہیں۔“

اس قسم کے خطوط کوئی سوانحی اہمیت نہیں رکھتے اور یہ ہیں بھی

تعداد میں بہت ٹھوڑے یہ زیادہ سے زیادہ غالب کی نثر نگاری کے اسلوب پر

روشنی ڈال سکتے ہیں۔

اب اول الذکر صورت یعنی بلا تاریخ کے خطوط کو لیجے جو اپنی اندرونی شہادت کی نوعیت کے لحاظ سے کسی نہ کسی دور سے متعلق کئے جا سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر شیونارا این کے موسومہ خط مورخہ ۳ مئی ۱۸۶۰ء کو لیجے جو شاعر کے دیوان کی اشاعت سے بحث کرتا ہے۔

”بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں اترا وہاں منشی ممتاز علی صاحب دوست قدیم جمکو ہے۔ انہوں نے کہا کہ اپنا اردو کا دیوان جمع کر بیجو۔ گا عظیم الدین ایک کتاب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے..... مجھے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لیکر بیجوں گا مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے۔ فواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ میں اب کہو کہ میں کیا کرتا دئی آکر ضیاء الدین خاں سے دیوان لیکر ایک آدمی کے ہاتھ فواب مصطفیٰ خاں کے پاس بیجو یا۔“

اب یوسف مرزا کے خط کا اقتباس ملاحظہ کیجئے جس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔

”میرا اردو کا دیوان میرے ہاتھ کو گیا۔ سکنہ شاہ نے گئے مصطفیٰ خاں

دے آئے۔ ڈاک میں اس کی رسید آگئی۔“

خط کا مضمون بتلاتا ہے کہ یہ متعلق ہے ۱۸۶۶ء سے۔ وہی سنہ جو مذکورہ بالا شیوناراہین والے خط پر درج ہے۔ اسی طرح نواب فیاض الدین خاں کا وہ خط بھی جو بلاتاریخ ہے (جس کا اقتباس درج ذیل ہے) اسی سال سے منسوب ہونا چاہئے۔

”جناب قبلہ دیکھو۔ آپ کو دیوان کے دینے میں تاخیر کیوں ہے۔ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا بغیر اس کے دیکھیے آپ کو کھانا نہیں ہوتا یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے ایک جلد ہزار جلد بن جائے میرا کام شہرت پانے بیاد خوش ہو۔ تمہاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں۔ تمہارے بھائی کی تعریف کی ترسب کی نظر سے گزرے۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں۔ رہا کتاب کے تلف ہو جانے کا اندیشہ یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی احیانا اگر ایسا ہوا اور دئی لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً سیل ڈاک رام پور جاؤنگا اور نواب نعر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔“

یوسف مرزا کے موسموہ ایک اور خط کا اقتباس ملاحظہ ہو جو بلاتاریخ ہے

”حکام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے میں نے سکہ کیا نہیں اگر کہا
 تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں اور گناہ بھی ہے تو کیا کیا
 سگین ہے کہ مکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے سبحان اللہ گو لہ انداز
 کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف
 ہو جائے اور شاعر کے دو مصرع معاف نہ ہوں۔“

مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ ۱۸۵۸ء کا خط ہے جبکہ اس فرمان شاہی کے
 ذریعہ جو ہندوستان کا منشور اعظم کہلاتا ہے عام معافی کا اعلان کیا گیا تھا۔
 اس طریقہ پر عمل ہوا کہ اندرونی شہادت کی رہنمائی میں کئی بے تالیخ
 خطوط (جو غالب کی زندگی کے کسی نہ کسی مسئلہ واقعہ کی طرف اشارہ کرتے
 ہیں) ان مختلف ادوار کے تحت رکھے جا سکتے ہیں جن کا تعین نقشہ
 منسلک میں کیا گیا ہے۔

اردو و کتب فارسی

ردیف	نام کتاب	تعداد	نوع	موضوع	تاریخ	ملاحظات
۱	کتابخانه	۱۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۲	کتابخانه	۲۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۳	کتابخانه	۳۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۴	کتابخانه	۴۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۵	کتابخانه	۵۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۶	کتابخانه	۶۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۷	کتابخانه	۷۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۸	کتابخانه	۸۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۹	کتابخانه	۹۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۱۰	کتابخانه	۱۰۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۱۱	کتابخانه	۱۱۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۱۲	کتابخانه	۱۲۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۱۳	کتابخانه	۱۳۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۱۴	کتابخانه	۱۴۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۱۵	کتابخانه	۱۵۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۱۶	کتابخانه	۱۶۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۱۷	کتابخانه	۱۷۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۱۸	کتابخانه	۱۸۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۱۹	کتابخانه	۱۹۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۲۰	کتابخانه	۲۰۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۲۱	کتابخانه	۲۱۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۲۲	کتابخانه	۲۲۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۲۳	کتابخانه	۲۳۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۲۴	کتابخانه	۲۴۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۲۵	کتابخانه	۲۵۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۲۶	کتابخانه	۲۶۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۲۷	کتابخانه	۲۷۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۲۸	کتابخانه	۲۸۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۲۹	کتابخانه	۲۹۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه
۳۰	کتابخانه	۳۰۰	کتاب	تاریخ	۱۳۰۵	کتابخانه

باب چہارم

مسائل غالب

سوانح حیات

کسی شاعر کا مطالعہ یا تو صرف اس کے کارناموں پر محدود ہو سکتا ہے یا اس مطالعہ میں اس کے سوانح حیات بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ چونکہ سوانح زندگی کاغذ کے شاعر کے محض کارناموں کے غور و فکر میں بھی ہر طرح مفید ثابت ہوگا اس لئے محقق کو غالب کی سرگزشت حیات کی نہ صرف تعمیر کہنی پڑے گی بلکہ اس کے ہر تفصیلی پہلو کو بلحاظ ضرورت اور تا بہ امکان، کلام شاعر سے مربوط و متعلق کر کے دکھانا پڑے گا۔

واضح رہے کہ کسی شاعر کے سوانح کی افتاد قدرتا ایک سادہ

داں یاد تیر کی سوانح عمری سے مختلف ہوگی یہ معلوم کرنا یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شاعر کہاں پیدا ہوا اس کے والدین کون تھے۔ نو عمری، عنفوان اور شباب کو کس طرح بسر کیا اور زندگی کی ہر منزل میں اس کو کن واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔ یوں تو اس قسم کے تفصیلی امور ہر شخص کی منضبط سوانح عمری کے لئے ضروری ہیں لیکن شاعر کے معاملہ میں ہمارا ذوق استفسار اس سے بھی آگے نکل جاتا ہے مثلاً اس کی زندگی کے ہر واقعہ میں کون سے مفہوم اور معانی پوشیدہ ہیں اور اس کا اثر شاعر کے ذہنی نمونہ اور ارتقاء پر کس طرح پڑا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حیات غالب کی ایک منضبط داستان کے مرتب کرنے میں کس قسم کا مواد ہماری دست رس میں ہے۔ اضافی ماخذوں میں اس وقت تک تو حالی کی یادگار غالب اور محمد حسین آزاد کے آب حیات والے سوانح خاکہ پر ہی نظر پڑتی ہے اس کے علاوہ بعض چھوٹے چھوٹے خاکے بھی ہیں جو دیوان غالب کے مختلف ادیشنوں میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن ان سے ہمیں خاطر خواہ مدد نہیں مل سکتی کہ یہ زیادہ تر حالی اور آزاد ہی کے مواد پر مبنی ہیں سب سے زیادہ اہمیت مطلق ماخذوں کو حاصل ہے لیکن یہ سب

باب چہارم

مسائل غالب

سوانح حیات

کسی شاعر کا مطالعہ یا تو صرف اس کے کارناموں پر محدود ہو سکتا ہے یا اس مطالعہ میں اس کے سوانح حیات بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ چونکہ سوانح زندگی کا خاکہ شاعر کے محض کارناموں کے غور و فکر میں بھی ہر طرح مفید ثابت ہوگا اس لئے محقق کو غالب کی سرگزشت حیات کی نہ صرف تعمیر کرنی پڑے گی بلکہ اس کے ہر تفصیلی پہلو کو بلحاظ ضرورت اور تاہم امکان، کلام شاعر سے مربوط و متعلق کر کے دیکھنا پڑے گا۔

واضح رہے کہ کئی شاعر کے سوانح کی افتاد قدرتنا ایک سادہ

کے سب ہمارا ہاتھ نہیں بٹا سکتے۔ ان ماخذوں میں خود غالب کے اردو اور فارسی مکاتیب، زندان والی مثنوی اور دستنبو ہیں۔ مؤخر الذکر ایک قسم کی آپ بیتی ہے جس میں ۱۸۵۶ء تا ۱۸۵۸ء کے حالات پائے جاتے ہیں۔ لے دے کر یہی ماخذ ایک محقق کا آخری سہارہ ہیں جن سے غالب کی زندگی کے تفصیلی واقعات معین کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں اردو خطوط خاص طور پر ہماری مدد کر سکتے ہیں کیونکہ یہ نہ صرف ان واقعات پر حاوی ہیں جو ۱۸۵۵ء تا ۱۸۶۹ء تک پیش آئے رہے بلکہ جگہ جگہ ان میں واقعات پیشین کی یاد بھی پائی جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ ماخذ خواہ وہ اضافی ہوں یا مطلق سوانح غالب کے متعلق پوری طرح ہماری پیاس کو نہیں بجھا سکتے پھر بھی ایک محقق ان سے کام ضرور لے سکتا ہے ان کی مدد سے وہ شاعر کی زندگی کا ایک سرسری خاکہ مرتب کر سکتا ہے اس میں جامعیت نہ سہی، نمایاں خدو خال تو صحت کے ساتھ معلوم ہو سکتے ہیں تیا مواد ہاتھ آتا ہے تو اس سرسری خاکہ میں اور بھی رنگ بھرے جا سکتے ہیں۔

موجودہ مواد سے کام لیتے وقت محقق کو وہ احتیاط ملحوظ رکھنی چاہئے جس کا اشارہ ہم کسی اگلے باب میں کر آئے ہیں یعنی وہ ہر چیز کو

محض اعتماد کی بناء پر قبول نہ کرے خواہ اس کے راوی خود غالب ہوں یا مولانا حالی اور آزاد۔ اس تاکید سے حاشیہ جتلانا مقصود نہیں ہے کہ وہ کھلم کھلا قارئین کی گمراہی کر رہے ہیں بلکہ اس کی غایت صرف یہ بتلانا ہے کہ ان بزرگوں نے واقعات کو صحت کے ساتھ بیان کرنے کی کافی زحمت برداشت نہیں کی مثلاً غالب کی زندگی کے ایک واقعہ کو لیجئے۔ غالب کا بیان ہے کہ اس نے پندرہ سال کی عمر یعنی تقریباً ۱۸۳۲ء سے اُدوہ میں غزلی کہنی شروع کی اور ابتدائی چند سال (ایک یا دو برس) تک وہ اپنا تخلص اسد کرتا رہا۔ لیکن اس کے اردو دیوان سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی اس کے لئے اس حصہ کلام کو ملاحظہ کیجئے جو پختہ عمر (۱۸۳۲ء تا ۱۸۵۵ء) میں موزوں ہوا اس میں آپ کو کئی غزلیں ایسی ملیں گی جن میں اسد تخلص کیا گیا ہے۔

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

دیکھا اسد کو غلوت و جلوت میں بارہا دیوانہ گم نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

ہمارے شعر میں اب صرف دل لگی کے اسد کھلا کہ فائدہ عرض ہنرمیں خاک نہیں

محمد حسین آزاد بھی اسی طرح بعض وقت صحت بیان کا خیال نہیں رکھتے۔ آپ حیات میں لکھتے ہیں کہ شاعر نے ۱۲۲۵ھ (۱۸۰۸ء) میں اپنا تخلص غالب اختیار کیا اس کی بھی تصدیق اس کے اردو دیوان سے نہیں ہوتی اور نہ آزاد یہ بتلاتے ہیں کہ انتخاب تخلص کی یہ تاریخ وہ کس بنیاد پر قرار دیتے ہیں۔

جیسا کہ باب اول میں ظاہر کیا گیا ہے عالی بھی شاعر کی تفصیلات زندگی کے معین کرنے میں ہمارے لئے خضر راہ نہیں بن سکتے۔ ان کی حقیقی دلچسپی غالب کے واقعات زندگی سے وابستہ نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان واقعات کی ترتیب بہت ہی منتشر اور پرالگ انداز میں پائی جاتی ہے۔ عالی کی اہل غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک شاعر اور دلفریب شخصیت کی حیثیت سے غالب کی عظمت کا سکہ قارئین کے دلوں پر بٹھا دیا جائے۔ اس اثر آفرینی کے شوق میں وہ بھول کر متنفاذ بیانات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مآخذ الصمد کے معاملہ پر پھر ایک مرتبہ غور کیجئے اور ذیل کے دو بیانات کا موازنہ کیجئے۔

” مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد ان کے مکان پر

وارد ہوا ہے۔“

اور کل دو برس اس نے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اس کی تعالیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے اس لئے مرزا کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد ایک فرضی نام ہے۔

» مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسی کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کی بول چال اور اون کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔»

اب یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ایک محقق کو جو مستند سوانحی مواد کی تعیین و ترتیب کرنا چاہتا ہے کس قدر ہوشیار رہنا چاہئے۔ اس کو حالی اور آزاد کے بیانات کی بھی مناسب قدر کرنی چاہئے اور ان کا مقابلہ ان واقعات سے کرنا چاہئے جن کو شاعر نے اپنی تصنیفات میں بیان کیا ہے پھر داد و تحسین کی کمزوریوں فطری فخر و مباہات اور شاعرانہ تعلق کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر رائے زنی کی جا سکتی ہے۔

شاعری

مطالعہ کلام غالب کے کیا مسائل ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے خود بخود ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے مسائل ہیں جو عام طور پر شاعری سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس سے پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود شاعری کیا ہے اور اس کا کس طرح تعین کیا جاسکتا ہے۔

اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہماری رہبری کے لئے شاعری کی تعریف اور نظریوں کی کمی نہیں لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ دفتر کس قدر وسیع اور پریشان کن ہے۔ بعض لوگ قوت شعری کو فن شعر سمجھ بیٹھے۔ بعض شاعری اور عام فن میں بمشکل امتیاز کر سکے۔ کسی نے شاعری کی ماہیت بیان کر دی اور کسی نے اس کی غرض و غایت پر اکتفا کیا۔ اس طرح کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ اب یہ بتلانے کہ کس خاص صاحب نظریہ سے ہمیں اس سوال کا جواب مل سکتا ہے کہ غالب کی شاعری کے کون سے مسائل

ہماری غور و فکر کے محتاج ہیں۔ کیا وہ مسائل یہ ہو سکتے ہیں کہ غالب کی شاعری "خیال و احساس کے باطنی زمان و مکان کی توضیح و تعبیر ہے" (ہیکل) "کیا وہ کوئی سیر ملّا خیال ہے" (کارلائل) "کیا وہ مثالیت کے مترادف ہے" (رو لینڈ ہرارڈ) "کیا وہ ایسا عالمگیر علم ہے جس سے نہ تو کوئی وحشی قوم معزّالہ ہے۔ اور نہ کوئی صاحب فہم قوم گمراہ ہے" (فلپ سڈنی) "کیا وہ جذبات کا ایک شعلو اور خوشی کی کوئی لہر ہے" (شارپ) "وہ کوئی ربّانی چیز ہے؟ علم و حکمت کا مرکز بھی ہے اور محیط بھی؟ بہترین اور پُر نشاط دماغوں کی بہترین اور پُر نشاط گھڑائیوں کا مرقع ہے؟ (شیلی) علم و فن سے بے نیاز، وہ علم کا نچوڑ اور جوہر لطیف یعنی بے ساختہ بول ہے۔ ہیجان کے ساتھ ساتھ دفور لذت کا سرچشمہ ہے؟ (ورڈس ورثق) "تخیل کے لئے جذبات عالیہ کا مجسم نغمہ ہے" (رسکن) "خاص خدا ہی کی کوئی چیز ہے؟ (ہیلی) "یا صرف ایک منظوم عبارت ہے؟ (ہیلی) وغیرہ وغیرہ۔ ملحوظ خاطر رہے کہ اس سلسلہ کو ہم نے صرف عصر حاضر کے نقادوں تک محدود رکھا۔

محقق کو یہ محسوس ہو گیا ہو گا کہ ان تعریفات کا اکثر حصہ دہندلی قدر پیمائیاں ہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ تعریفات اور نظریوں

کی ان بھول بھلیوں میں پڑنے کے بجائے وہ چند صاف سیدھے سوالات کرے اور ان کے اثر کا تاثر دیکھے۔

جب ہم کسی شاعر کی کسی نظم کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے؟ اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ نظم دراصل ایک آلہ ہے جس سے شاعر اپنے باطنی تجربہ کو اور دن تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے یہ گویا اس کی واردات قلب کا ایک آئینہ ہے جس میں اوروں کو بھی اپنے دل کی بات نظر آتی ہے اب نظر دوڑا کر یہ دیکھنا چاہئے کہ شاعر اس کوشش میں کتنی منزلیں طے کرتا ہے۔ ہم نے ابھی ابھی یہ بیان کیا کہ نظم اصل میں ایک آلہ اظہار ہے سوال یہ ہے کہ اس کے مختلف اجزاء کیا ہیں؟ سب سے پہلے الفاظ ہیں جن کو ہم "لفظیات شعر" کے نام سے یاد کرتے ہیں پھر وہ خاص طریقہ ہے جس کی مدد سے ان الفاظ کو صنعت گری کے ساتھ کچھ اس طرح جوڑ دیا جاتا ہے کہ ان میں تکمیل اور وحدت یا ہم آہنگی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ یہ طریقہ اصطلاح میں "تنظیم شعر" کہلاتا ہے اس ساری کاوش کا نتیجہ "صورت شعر" ہے جس کا منشاء سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ شاعر کے دل کی بات یعنی اس کے شعراء تجربہ کی ترجمانی کرے یہ شاعرانہ تجربہ کس طرح ظہور میں آتا ہے؟

شاعر کے دل میں ایک بات اتر جاتی ہے جو یا تو خود اس کی اپنی یا
 ادروں کی زندگی کے کسی واقعہ پر مبنی ہوتی ہے یا کسی خیال، کنایہ یا
 یاد پر۔ یہی شاعر کا مواد کہلاتا ہے۔ یہ مواد شاعر کے دل میں جاگزیں
 ہو کر اس کے تخیل کے زیر اثر کفیات، احساسات اور تعبیرات کو اکٹاتا
 اور خود ان میں گم ہو جاتا ہے بہ الفاظ دیگر وہ شاعر کی روح میں سما کر
 کچھ اس طرح شبیر و شکر ہو جاتا ہے کہ اسی کا ایک مستقل اور لاینفک جز
 بن جاتا ہے اس کو ادبی تنقید کی زبان میں "القا" کہتے ہیں۔ یہ القا
 ہر شخص پر طاری ہو سکتا ہے لیکن جب تک کہ وہ خاص روپ یا
 نثر یا ن اصطلاح ایک مستقل شکل میں "تصویر پذیر" نہ ہوے باطنی عمل
 مکمل نہیں ہو سکتا یہ عمل اگر مکمل ہو بھی جائے تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے
 کہ شاعری وجود میں آگئی۔

صرف تصور "شاعری نہیں۔ ہم میں کے سب نہیں تو بعض ضرور
 ایسے ہیں جن کے دلوں میں ہر روز کوئی نہ کوئی بات اتر کر القا کی کیفیت
 پیدا کر دیتی ہے اور بعض اوقات یہ القار ایک موزون اور مستقل
 صورت بھی اختیار کر لیتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسی کا نام شاعر
 ہے اور کیا ہم سچ شاعر ہو گئے؟ ہم بیشک اس مرتبہ پر فائز ہو سکتے
 ہیں۔ بشرطیکہ ہم اپنے تصور کو اس کے تمام خدو خال کے ساتھ ادروں

تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں لیکن یہ ہمارے بس کی چیز نہیں
 ایک سچا شاعر زبان کے سہارے اس کو کر دکھاتا ہے مکمل نظم دراصل
 باطنی تصور کی آئینہ بردار ہے وہ صورتاً اپنی اصل سے جس قدر
 قریب ہوگی اسی قدر اس کا پایہ بہ حیثیت فن بلند ہوگا اور شاعر
 کا مرتبہ بھی ایک صاحب فن کے اعتبار سے اعلیٰ وارفع
 ہوگا۔

مذکورہ بالا گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نظم کی ابتداء شاعرانہ
 اضطراب سے ہوتی ہے جس کو ہم "ابتدائی ہیجان" سے تعبیر کر سکتے ہیں
 یہ ہیجان جو کسی نہ کسی وجہ پیدا ہو جاتا ہے شاعر کے دل پر اثر انداز
 ہوتا اور اس کی روح میں بس جاتا ہے۔ پھر اس پر بعض کیفیات
 و خیالات کو طاری کر کے ایسی "مخصوص" شان حاصل کر لیتا
 ہے جو جلد یا بتدریج ایک صورت اختیار کرتا اور بالآخر زبان
 کے ذریعہ لباس نظم میں دنیا کے سامنے پیش ہوتا ہے۔

اس عمل کی مختلف ارتقائی منزلیں ہمارے پیش نظر رہنی
 چاہئیں تاکہ اس امر کا تعین ہو سکے کہ غالب کی شاعری سے کون
 سے سوالات درحقیقت متعلق ہیں۔

لیکن اس پر عمل پیرا ہونے سے پہلے محقق کو غزل گوئی کی

چند خصوصیات پر غور کرنا پڑے گا۔

سب سے اول تو یہ کہ غزل کی حیثیت نظم کی نہیں اس میں نہ تو وحدت پائی جاتی ہے اور نہ اس کے باہمی اجزاء میں کوئی ہم آہنگی اس لئے اس کی کوئی عضوی صورت بھی نہیں غزل الگ الگ اشعار کا گچھا ہے اس میں کبھی کبھی ایک خاص مفہوم ایک سے زائد اشعار میں جملکنے لگتا ہے۔ لیکن عموماً ہر شعر اپنا مستقل وجود رکھتا ہے ایک شعر کا دوسرے شعر سے اگر کوئی تعلق ہوتا بھی ہے تو اس کی بنیاد صرف وہ آواز ہے جو ردیف یا قافیہ سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی اہمیت سوائے ترنم کے اور کچھ نہیں۔

اس طرح ایک غزل گو شاعر کا دائرہ عمل بہت ہی تنگ اور محدود ہوتا ہے یعنی صرف ایک شعر۔ ایک اچانک خیال یا الفاظ کی ماہرانہ ترنم کیسے اس کے فن یعنی فن غزل گوئی کی تمام چمیدگیوں کی حامل ہو سکتی ہیں۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ مسدس۔ ترجیع بند کا البتہ یہ حال نہیں ان کا دائرہ عمل نسبتاً وسیع ہوتا ہے اور جذبہ و تخیل میں ربط و تسلسل پایا جاتا ہے نیز شاعر کو ان اصناف میں زیادہ کمال صرف کرنا پڑتا ہے شاید اسی بنا پر غالب نے ایک مرتبہ محسوس کیا کہ اس کا بہترین کمال اس کے

قصائد میں ہے۔ اس کمال سے غالباً اس کا منشا اس کا اپنا فنیہ کمال ہے کیونکہ اس کی بہترین اشاعری، مسلمہ طور پر اس کی غزلوں ہی میں پائی جاتی ہے۔

غزل گوئی کی دوسری خصوصیت جو ہر اچھوتے سے اچھوتے احساس کا گلہ گھونٹ دیتی ہے وہ ان چند خاص مقررہ اوزان، صنائع بدائع، اور تشبیہ و استعارہ کی تقویم پارینہ کی روایتی پابندی ہے۔ جو فارسی اور اس کی راہ سے عربی سے مستعار لئے گئے ہیں موجودہ زمانہ میں رسم و قدامت کی زنجیریں آسانی سے توڑی جاسکتی ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں خود غالب کے لئے جو حتی الامکان رسم پرستی کے خلاف جنگ آزما ہوتا تھا یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ غالب میں ایک طرف تو رسم قدیم کی پابندی نظر آتی ہے اور دوسری طرف اس لکیر سے بہت کر خود اپنا ایک الگ راستہ بنانے کی محسوس مگر دبی ہوئی کوشش اس آخری پہلو سے اگر اس کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ وہ مقررہ اوزان و بحر کی کوتاہیوں سے اپنا سر نہیں اٹھا سکا البتہ گا ہے ماہے مقررہ لفظیات

سے بلند نکل گیا۔

یہ معلوم کرنا مشکل نہیں کہ غالب کے کن اشعار میں پرانا رنگ
 نمایاں ہے لیکن چونکہ رسمی الفاظ بھی بعض اوقات ایک اصلی احساس کو
 جامہ پہنا سکتے ہیں اس لئے رسمی اشعار کا تعین کرنا محض ایک قیاس پر
 مبنی ہوگا۔ اسی طرح باقی تمام اشعار کو شاعر کے اصلی شاعرانہ تجربہ کا مظہر قرار
 دینا بھی ایک قیاسی چیز سمجھی جائیگی تاہم بعض اشعار کے متعلق یہ بتلانا
 زیادہ مشکل نہیں ہے کہ وہ اپنی خصوصیت پنہاں یا شاعر کے بعض واقعات
 زندگی کے لحاظ سے اپنے اندر اصلیت کی شان رکھتے ہیں۔

انگلستان کے مشہور نقاد اور شاعر مسٹر لیا سلس کر
 اپنے دلپذیر اور فکر انگیز رسالہ نظریہ شاعری میں یہ بیان کرتے
 ہیں کہ "کسی شاعر کا القار انسان کی زندگی کے ان امور سے وابستہ
 نہیں ہوتا ہے جن کو واضح کرنے کی ناکام کوشش اس کی
 سوانح عمری میں کی جاتی ہے۔" یہ خیال رزمیہ یا تمثیلی شاعری
 پر عیاں صادق آسکتا ہے بلکہ شاید تخلیقی سرودی شاعری "یا
 "خیالی سرودی شاعری" پر بھی پورا اترے۔ لیکن یہ کسی طرح

بھی خالص اور وجدانی شاعر سی پم پورے طور پر چسپاں نہیں ہوتا۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ”رگبی چیل“ میں عالمی اثر کے علاوہ پس پردہ سوانحی رنگ بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔ ملٹن کا سائٹ اپنی ”نابینائی“ پر کبھی اس درجہ کا دلگداز اور جذبہ بیلا سائٹ نہیں ہوتا اگر اس میں عالمی عنصر کو اپنی ذاتی مصیبت میں جذبہ کر کے کشالی قالب میں پیش نہ کیا جاتا۔ یہی بات ”لسی ڈاس“، ”تھر سس“، ”ان میموریم“، ”یولی سس“ اور اسی قسم کی نظموں میں پائی جاتی ہے۔ اگر شاعرانہ پیداوار، شاعر کی زندگی سے مربوط کر کے نہ دکھائی جائے تو غالب کے ان اشعار کے تعین کرنے کا ایک قوی آلہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا، جو اس کے ذاتی جذبات کے منظر ہیں۔ اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ذیل اشعار جو عارف کی وفات پر لکھے گئے تھے باوجود اپنے عالمگیر اثر اور دائرہ عمل کے اپنے اندر کوئی سوانحی اہمیت نہیں رکھتے۔

لازم تھا کہ دیکھو مرادستہ کوئی دن اور
تہنا گئے کیوں اب رہو تہنا کوئی دن اہ
مٹ جائیگا گر تیرا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پتیرے ناصر فرسا کوئی دن اہ

تے ہوکل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
 مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
 جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
 کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
 ہاں لے تلک پیر جواں تھا ابھی عارف
 کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرنا کوئی دن اور
 تم کون سے ایسے تھے کہرے داد و تند کے
 کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
 مجھ سے تمہیں نفرت ہی نیر سے لڑائی
 بچوں کا بھی دیکھا نہ تھا سا کوئی دن اور
 گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش ناخوش
 کرنا تھا جواں مرگب گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب

قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

یہی وہ شخص فی نوعیت ہے جو اس مرثیہ کے عالمگیر اثر میں جاوے

پیدا کر رہی ہے۔

اب ہم پھر غالب کی شاعری کی طرف لوٹ کر یہ دیکھیں گے

کون سے سوالات اس کے مباحث سے متعلق ہیں۔

۱۔ ابتدائی ہیجان۔

وہ کون سی دنیا تھی جس سے غالب کو اپنی شاعری کیلئے

موضوع ہاتھ آئے۔ ان میں بعض موضوع تو رسم پرستی کے حلقہ

سے متعلق ہوں گے۔ اور بعض خود اس کی اپنی ذات سے۔ کیا

محقق ان دونوں میں امتیاز اور ان کا تجزیہ کر سکتا ہے؟ ہر

صورت میں ابتدائی ہیجان اور محرکات کیا تھے ؟

۲۔ القار۔

اس کے موضوعات نے خود اس کے ذہن پہ کیا ردِ عمل کیا اور کیا یہ ردِ عمل اس کے ذہن کی کسی ہم آہنگ مرکز کی مصروفیت سے متعلق کیا جاسکتا ہے ؟ بہ الفاظ دیگر یہ مختلف موضوع اس کے ذہن میں بالآخر کیا شان اختیار کرتے ہیں اور کیا یہ شان خود شاعر کے دماغی اور جذباتی رجحان حیات سے متاثر ہوئی ؟

۳۔ تصور۔

ہر شان بالآخر کس شکل، صورت یا تصور میں شاعر کے ذہن پہ، اس کے رجحان حیات کے زیر اثر ہتکن ہوئی۔
۴۔ لفظیات شعر۔

کیون سی زبان یا لفظیات شعر، شاعر نے اپنے تصور کی ترجمانی کے لئے منتخب کی ؟ کس حد تک اس نے قدیم ذخیرے سے کام لیا اور کس حد تک اس سے اجتناب کیا ؟

۵۔ تنظیم شعر اور صورت شعر۔

لفظیات شعر میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور اس کو صورت بخشنے

کے کیا وسائل اس نے اختیار کئے ؟ اس سلسلہ میں اس کی منت پذیریری کا پتہ لگایا جاسکتا ہے ؟ خاص خاص ردیفیں اور خاص خاص صورتیں شاعری کے مختلف دودن میں اس کو زیادہ مرغوب رہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ بعض ردیفوں کو اس نے بالکل ہی نہیں لگایا۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک ہی غزل یا ایک ہی صورت اظہار میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ شعر پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں۔

اب یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ غالب جیسے غزل گو شاعر کی منزلت معلوم کرنے کے لئے ہمیں نہ صرف فرد فرد انہر شعر کے شعری عمل پر غور کرنا چاہئے بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کسی شعری پیداوار میں مجموعی حیثیت سے تمام اشعار کا کیا درجہ ہے ؟ وجدانی شاعری کے مجموعی غور و فکر کے پھر یہ معنی ہوئے کہ شاعر کی حیاتی زاویہ نگاہ کی بنیاد پر تعمیر کی جائے ان حالات میں صحیح رائے زنی اور ہی وقت ممکن ہے کہ پہلے اس زاویہ نگاہ کو مشخص کر لیا جائے۔

پانچم

غالب کا زاویہ نگاہ زندگی کے متعلق

انسان کا زاویہ نگاہ کوئی معین چیز نہیں۔ اکثر و بیشتر یہ تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہوتا ہے۔ زندگی کے ساتھ ساتھ یہ بھی اپنا رنگ اور روپ بدلتا رہتا ہے اسی لئے ہم اس کو جامد اور ساکن چیز نہیں بلکہ حرکت و بنیابی کا سیلاب سمجھتے ہیں جو انسانی گوشت پوست کی طرح بڑھتا رہتا ہے، بچپن، لڑکپن سے اور لڑکپن شباب سے بدل جاتا ہے جس کے ساتھ پختگی اور بزرگی کے رنگ چڑھنے لگتے ہیں اسی طرح انسان کا زاویہ نگاہ زندگی کا ایک خاص انداز ہے جس کو ذہن انسانی اندرونی و بیرونی قوتوں کے زیر اثر رفتہ رفتہ حاصل کرتا ہے اس لئے اس مسئلہ کی تحقیق تاریخی نقطہ سے کرنی ضروری ہے

بہ الفاظ دیگر ایک محقق کا یہ فرض ہے کہ غالب کے زاویہ نگاہ پر ذورفا
غور فکر کرنے سے پہلے ان تمام قوتوں کی تاریخ اور خصوصیت سے
واقف ہو جائے جو دوران حیات میں اس کے ذہن پر
کار فرما رہے۔

خارجی اثرات

سب سے پہلے ان اثرات کی چھان بین کرنی چاہئے جو
اس (غالب) کے گھر کی ابتدائی گھر کی تعلیم و تربیت سے متب
ہوئے، اگر اس کے والد اور اکلوتے چچا کا انتقال پانچ برس کی
عمر سے پہلے ہی ہو چکا تھا جیسا کہ خود غالب کہتا ہے تو پھر یہ سوال
پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اس کی پرورش کی؟
وہ کس قسم کے لوگ تھے اور کس ڈھب سے انہوں نے اس کے
دل و دماغ پر نقش بھائے؟ تعلیم کس قسم کی دی گئی اور اس
کے تعلیم دینے والے کون تھے؟ عبد الصمد اور شیخ معظم اس کے
استاد بیان کئے جاتے ہیں۔ ان کی بنیم تعلیم سے اس کو کیا

فیض حاصل ہوا۔ اس کے اور بھی کوئی استاد تھے جن کے فیض و اثر کلپتہ چلایا جاسکتا ہے؛ کون سے مفامین اور کتاہیں اس کو سب سے زیادہ مرغوب تھیں بعض تو الموں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی غزل گوئی پر نظیر می، عوفی، طہوری، شیخ علی حزمین، اور طالب آملی کے بھی اثرات پڑے ہیں۔ ان کا اثر ممکن ہے کہ اس کی تنظیم شعر پر پڑا ہو لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے خیالات پر اس کے اثرات کس طرح مترتب ہوئے۔

دوسرا جز جو انسان کی ذہنی نشوونما پر کار فرما رہتا ہے وہ اس کا سماجی ماحول ہے جس میں وہ (ذہن) پلتا ہے۔ غالب اگرہ میں پیدا ہوا لیکن اس کی نو عمری کا بڑا حصہ دہلی میں بسر ہوا جہاں اس نے مسائل اقامت اختیار کر لی، یہاں اس کو بہادر شاہ کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی، یہ دربار اس معاشرتی تنظیم کا منظر تھا، جس کا شیرازہ سارے شمالی ہند میں بکھرا ہوا تھا۔ غالب نے اگرچہ دہلی کو اپنا گھر بنا لیا تھا لیکن زمانہ کی گردش اس کو کلکتہ لکھنؤ، رام پور، بنارس اور دیگر مقامات پر لئے لئے پھری جہاں اس کو بھانت بھانت کی چیزوں اور نت نئے انسانوں سے سابقہ پڑا۔ کیا محقق ان لغوش کو اجاگر کر سکتا

ہے جو مختلف مقامات پر اس کے دل و دماغ بہم رتسم
ہوئے ؟

اس کے بعد ان واقعات کی جستجو کرنی چاہئے جو بلحاظ
نوعیت اُس کے عام زاویہ نگاہ میں غفل انداز ہوئے، انسان کو
ہمیشہ چین کی زندگی نصیب نہیں ہوتی ایسے واقعات بھی پیش آتے
ہیں جو اس کی دماغ کی رو کو بدل دیتے ہیں چنانچہ قمار بازی کے جرم
میں سزائے قید کا بھگتنا غالب کی زندگی میں اسی قسم کا ایک
واقعہ ہے۔ دوسرا واقعہ ۱۸۵۷ء کا قیامت خیز غدر ہے۔ اسلامی
طبقہ پر یہ ایک مصیبت تھی جس کی زد میں بہت سے مسلمان آگئے
اور غالب بھی اس زد سے نہ بچ سکا اس کی مالی حالت خاص طور
پر اس واقعہ سے متاثر ہوئی۔ ان دو واقعات میں قید ہی کو سب
سے زیادہ اہمیت دینی چاہئے اور اس میں کسی قسم کے شبہ کی
گنجائش نہیں کہ خود غالب کو اس کا بڑا اہدمہ ہوا جس کا اظہار
وہ ان الفاظ میں کرتا ہے :-

” میری یہ آرزو ہے کہ میں دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں
تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد
ہے یہ بھی جانے دو کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمتہ اللعالمین

دل دادوں کی تکیہ گاہ - دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ در ماندگی
 قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے نجات پاؤں
 اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل قرار دوں ہر بھرا نکل جاؤں -

یہ واقعہ اس کی وفات سے کوئی بیس سال پہلے کا ہے اس
 نئے محقق کو پایا ان عمر کے کلام میں ان واقعات کو ڈھونڈھ نکالنا چاہئے
 جو کسی رد عمل کا پتہ دیتے ہوں - قید کے زمانہ میں غالب نے فارسی
 میں ایک ترکیب بند لکھا تھا - جس سے مردم بیزاری کی
 بو آتی ہے -

انچہ فر دست ہم امروز درآمد گوئی آفتاب از جہت قبلہ برآمد گوئی
 دل دوستے کہ مرالود فر ماند ز کار شب و روزے کہ مرالود برآمد گوئی
 بہرہ اہل جہاں چون ز جہاں درد و غم است
 بہرہ من ز جہاں بیشتر آمد گوئی

راز دانا غم رسوائی جاوید بلاست بہر آزار غم از قید فرنگم نہ بود
 جور اعدا و داند دل برہائی لیکن طعن احباب کم از زخم فدیہم نہ بود

کیا یہ بات اس کی غیر معمولی مصیبت سے بیکار یکا ظہور میں آگئی یا جو چیز پہلے ہی سے اس میں موجود تھی اسی کے اظہار کی یہ ایک شدید صورت تھی۔ اگر یہ زندان کی بے ساختہ پیداوار تھی تو اس کے بعد زندگی میں کوئی ایسے واقعات بھی پیش آئے، جنہوں نے اس رجحان کو دھیا کر دیا۔ یا وہ اسی کے ساتھ چوند فاک ہو گیا۔ اور مرتے دم تک وہ اپنی ہر سرگزشت حیات کو اسی کی یاد میں محو کرتا رہا۔

شخصی رجحانات

اس کی زندگی کے ان خارجی واقعات کے علاوہ جن سے اس کے افکار و خیالات متاثر ہوئے۔ ہمیں یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ کون سے رجحانات تھے جو خود اس کے خون میں موجود تھے یا جن کی اس نے پرورش کی۔

غالب اپنے آبا و اجداد کو، جہاں تک اس کا حافظہ کام دیتا

ہے سپاہی پیشہ بنتا ہے بعض دوسروں کی خانہ جنگی میں کام آئے
جن میں اس کے والد بھی شامل ہیں اور وہ اپنے اس "پیشہ آبا"
پر نازان بھی ہے۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

اگر اجورہ داری اس کے خاندان کی خصوصیت تھی تو کیا اس

رجحان کا ظہور کسی نہ کسی ڈھب سے ہمارے شاعر میں بھی ہوا

کیا اور ایسے رجحانات کا بھی پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ جن کا اثر اس

کی عادات و کیفیات اور اخلاق پر پڑا ہو۔ اگر ایسا نہ کیا جائے

تو اس کی طبعی خصوصیات کی توضیح، نیز اس کو ذاتی کمزوریوں

سے الگ کر کے سمجھنے میں دشواری لاحق ہوگی۔ اگر کوئی محقق،

زندگی اور حسن کاری میں نظریہ تواریت کا قائل نہیں ہے تو

اسے غائب کی تمام گتھیاں سلجھانی پڑیں گی اور یہ بتلانا پڑے گا

کہ بعض ایسے رجحانات کی آخر کیسی پرورش ہوئی جن کی جھلک اس

کی تحریکات میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

بے اطمینانی کی بے

غالب کی زندگی شروع سے آخر تک بے اطمینانی سے لبریز ہے یہ چیز شاعر میں سب سے زیادہ بلند آہنگ معلوم ہوتی ہے۔ بے اطمینانی کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں شان رجبو بیت پائی جاتی ہے جس سے آدمی میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ عالم جس میں وہ رہتا رہتا ہے ایسا نہیں ہے جیسا کہ اس کو ہونا چاہئے پھر دل میں ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ کاش بساط زندگی پر پاکیزہ اور ارفع خیالات کی ایک چادر چھا جائے جو ابن آدم میں مشیت الہی کی تبلیغ کرے۔ اس کی ایک اور صورت ہے جس میں انسان اپنے ماحول یا افتاد زندگی سے بے اطمینان ہو جاتا ہے۔ یہ بے اطمینانی کسی حقیقی یا خیالی نقصان یا ناقدری کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان کو مردم بیزار یا متنفر بنا دیتی ہے۔ اسی قسم کی بے اطمینانی غالب کی روح میں سما گئی تھی اس نتیجہ پر پہنچنے میں محقق کو کسی قسم کی دقت نہیں پیش

آئے گا، کیونکہ شاعر کی جبین حیات پر جھلکتی اور اوس کی تحریرات میں شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ اب محقق کا کام یہ ہے کہ اس بے اطمینانی کے سرچشمہ کی تلاش کرے۔

غالب کو ہمیشہ دو چیزوں کی شکایت رہی ایک تو اس کی ادبی کوششوں کی ناقدری اور دوسرے اس کی مالی مشکلات ان دونوں شکایتوں کی تحقیق احتیاط کے ساتھ کرنی ضروری ہے جیسا کہ معلوم ہے غالب نے اوائل عمر ہی میں آگرہ سے ہجرت کی اور دہلی میں آبا۔ دہلی نے اس کے ساتھ کیا بہتناؤ کیا؛ دربار شاہی نے خیر مقدم کیا اور اپنے بس کے تمام الطاف و اکرام سے اس کو نوازا، نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطابات عطا کئے جو شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے شخص کے لئے معراج سمجھے جاتے تھے۔ منصب بھی عطا ہوا۔ جو اگرچہ زیادہ معقول نہ تھا لیکن حاکم وقت کی بیچارگی کے لحاظ سے خاصہ تقایہ منصب اور خطابات کسی آبا فی سپاہیانہ پیشہ کے صلہ میں نہیں بلکہ اس کی ادبی فتوحات کے صلہ میں عطا کئے گئے تھے۔ یہ اس کے جوہر ذاتی کی کافی قدر دانی تھی۔ ایسی ہی قدر و منزلت لکھنؤ اور رام پور میں بھی ہوئی۔ اس کے علاوہ اہل علم قدر دانان سخن کی

بھی کمی نہ تھی۔ جو اس کے کلام کو بنظر تحسین دیکھا کرتے۔ فضل حق اور نبی بخش جیسے نقاد، جن کی رائے کی خود غالب کے دل میں وقعت تھی اس کے شاعرانہ کمالات کے معترف تھے اور حق تو یہ ہے کہ یہی لوگ اس کو شاعری کی اعلیٰ تر، مہوں کے لئے ابھارا کرتے تھے نیز ایسے احباب اور قدر شناسوں کا روز افزوں حلقہ بھی تھا جو ۱۰۵ سخن میں اس کو اپنا رہبر اور مضمون سمجھانے والا سمجھتے تھے چاہئے والوں کے اس حلقہ میں حالی، نیر، رخشآن، سالک، مجروح، تفتہ، شفیقتہ اور وحشت جیسے افراد نظر آتے ہیں۔

پھر بھی غالب کو اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ اس کو یہ معلوم ہونا چاہئے تھا کہ وہ ایک مخصوص طبقہ کا شاعر تھا۔ اور اپنے ہم عصر ذوق کی عام مقبولیت اس کے حصہ میں نہیں آسکتی تھی۔ اس کی لفظیات اور اسلوب اس قدر غریب تھے کہ عام لوگ اس کے پر جوش اور بعض اوقات نرے تخیل کی روشوں میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے، ایسی حالت میں چاہئے تو یہ تھا کہ خود اس کا احساس کمال ہی اس کی تسکین کا سامان بنتا۔

نازدیو انہم کہ ہرست سخن خواهد شدن
 کو کیم یاد در عدم اوج قبولی بودہ است
 این سے اندر قحط خریداری کہن خواهد شدن
 شہرت شعرم بگیتی بعد من خواهد شدن
 اکثر اوقات شاعر، اپنی اعلیٰ تمناؤں کو بھول بیٹھا۔

مالی معاملات میں بھی اس کا یہی انداز تھا۔ مالی کی مستقل
 شہادت موجود ہے کہ غالب اس حیثیت سے ناموافق حالات
 میں کبھی گرفتار نہیں ہوا۔ دوستوں اور مرہیوں کی مالی اعانت
 کی بھی کوئی انتہا نہ تھی لیکن اس کے دل میں قناعت کی لہر
 تک پیدا نہیں ہوئی۔ اس کا فی شاعر ہنس کی طرح اس کا
 خیال تھا کہ وہ ایک لطیفہ یعنی ہے اور دنیا والوں کا یہ فرض ہے
 کہ اس کو احتیاجات سے بالاتر کر دیں اور ہر قسم کی سخت اور
 توقیر اس کے قدموں پر نثار کریں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ دنیا
 نے اس کو نہ صرف اعتیاج سے بالاتر رکھا بلکہ سر آنکھوں پر
 جگہ دی کسی ہم عصر صاحب علم و فضل کی اس سے بڑھ کر قدر و منزلت
 نہیں ہوئی۔ لیکن غالب کے ذہن کی ساخت ہی کچھ ایسی
 تھی کہ وہ نہ تو عطائے رحمانی کا شکر گزار تھا اور نہ کسی انسانی
 خدمات کا۔ خلافت مردانگی وہ ہمیشہ کرے مضاہی رہا۔

دل میں ذوق مصلح یادیا ترک باقی نہیں آگے اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مزنے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں سولے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

ہے سبزہ زار ہر درو دیوار غم نہ جس کی بہاریہ سہی پھر کسی نہا نہ پوچھ

زندگی اپنی جب اس شکل ہو گزری نا ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا کھتے تھے

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کوئی نہ ہو

ہفت آسیا بگردش نادرمیان او غالب دگر میرس کہ برما چہ میرود

جو ہر طبع ہم درخشان ست و لیک روزم اندر ابہ پہناں میرود

تو میری ماگردش ایام ندارد روزیکہ یہ شد معرود شام ندارد

یہ جستہ جستہ اشعار ہیں جن میں شخصی عنہر شایذ زیادہ نہ ہو لیکن

اس کی فارسی مثنوی ابرہ گہر بار کو لیجئے جو اسی وفات کے چند سال قبل لکھی گئی تھی، یہ ایک طویل مناجات ہے جس میں اہمیت پائی کو جوش دلایا گیا ہے کہ وہ اس کی بشری کمزوری کو بخش دے اس مقام پر امید تھی کہ غالب کا سر نیاز جھک جائے گا کہ اس نے کفران نعمت کیا اور اپنی ان خدا داد شاعرانہ قوتوں کو خام مقصد کی تلاش میں ٹھکرا دیا جن سے وہ آشفته حال ایسا مصیبت کو مسرت و راحت کے لازوال نغمے سنا سکتا تھا۔ لیکن غالب ایسا کیوں کرنے چلا تھا۔ وہ پھر کھالٹے غذا ہی کو مورد الزام قرار دیتا ہے کہ اس نے ظرف و حوصلہ سے زیادہ غم اس کے حصہ میں دیدیا۔ یہاں تک کہ وہ عطیات ربانی کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔

چہ گویم بہ آں گفتہ زینہارده	مرانیز بارائے گفتارده
بود بندہ خستہ گستاخ گوئے	دریں خستگی پوزش از من مجوئے
چہ می کردم اے بندہ پروردگائے	من اندوگین و مے اندوہ ربائے
ز جمشید و بہرام و پیر و نیز جوئے	حساب منے و رامش و رنگ و لوئے
بہ در یوزہ رخ بردہ باشم سیاہ	نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ
چو صد و جلدہ خونم تہا و دزدل	چہ پیش رگے را بکار دزدل

بہر جسم کز روئے دفتر رسد زمین حسرتے در برابر رسد
 بفرمانے کیں داوری چوں بود کہ از جرم من حسرت افزوں بود
 ہر آئینہ ہم چوں منے را بہ بند تلافی فراخور بود نے گزند
 بگیتی درم بے نوا داشتی دل من اسیر ہوا داشتی
 نہ بخشندہ شاہے کہ با رم دیدہ بہر بار زہر پیل یا رم دیدہ

کہ چوں پیل ز آں جا بہ انگیزے

زرش بہر گدایاں فرور بندے

جب انسان کی غم گینبی یہ صورت اختیار کر لیتی ہے کہ وہ خدا سے برسرو پیکار ہو جاتا ہے تو اس کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے محقق کو اس کیفیت کے ارتقار کا پتہ بڑھی احتیاط کے ساتھ لگانا چاہئے۔ اور اس بات کو واضح کرنا چاہئے کہ ایک شخص جو عقل و فہم سے اس قدر مالا مال تھا کس طرح اس بلا کی نلخی و الم کا شکار ہو گیا حالی اس کی یوں قہقہہ کرتے ہیں کہ غالب نے بیزاری اور بے اطمینانی کا یہ میدان اپنے جو ہر شعر کو چمکانے کے لئے پسند کیا تھا جس طرح اور شعراء نے عشق و مدح سرائی کے میدان اپنے لئے منتخب کر لئے یہہ عذر اس قدر عجیب ہے کہ غالب کے محقق کو اس

سے مرعوب نہیں ہونا چاہئے یہ کوئی ادبی تنقید نہیں بلکہ بے محل خوش اخلاقی ہے۔ بھلا کون شخص محض شوق و تفریح میں دن رات آہ و زاری کر سکتا ہے۔ یہ بات تو دودب و خود غالب ہی سے پوچھنی چاہئے۔ پھر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ نظم و نثر میں جو وہ بار بار اپنی نمائندگی کا اظہار کرتا ہے وہ صحیح ہے۔

مذہب

غالب کا ایک رجحان اور بھی توجہ کا محتاج ہے۔ ذکور و انات کی کثیر تعداد کے حق میں مذہب ایک مقدس چیز ہے اور وہ اس سے کھیلا نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ دنیاوی اغراض کے لئے بھی اس کو ہاتھ لگانا پسند نہیں کرتے لیکن غالب نے ہمیشہ اس کے ساتھ آنکھ مچولی کی بنیادی کے اس مشہور حصہ کو دیکھنے جس میں بہادر شاہ کو شیعہ رجحانات سے میراد کھانے کی کوشش کی گئی ہے، عالی

صاحب فرماتے ہیں ” جب یہ نثنوی لکھنو بھیجی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت ایسا اور ایسا لکھا ہے مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم سرکار ہوں جو کچھ بادشاہ حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ نثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائیے۔“

پھر اس بات پر بھی غور کیجئے کہ وہابی فرقہ کے عقیدہ کے خلاف فارسی میں ایک نثنوی لکھ کر اس نے اپنے دوست مولانا فضل حق کا دل کس طرح خوش کیا حالانکہ اس کا ذاتی رجحان بالکل اس کے خلاف تھا اس سلسلہ میں وہ رباعی بھی ملاحظہ کیجئے جس میں بہادر شاہ سے خطاب کیا گیا ہے۔

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری کہتے ہیں مجھ وہ رافضی اور دہری
 دہری کیوں کہ ہو جو کہ ہو دے صوفی شیعہ کیوں کہ ہو مادر انہسری
 پھر لطف دیکھئے کہ اپنے ایک خط میں جو اس کے شیعہ دوست
 سید غلام حسین بلگرامی کو لکھا گیا تھا۔ خود کو ”قالب اثنا عشری حیدری“
 بتاتا ہے۔ آخر ان کعبلوں سے فائدہ؟ زندگی کے ایسے اہم ادارہ

مقدس معاملہ میں غالب بقول مآلی اس قدر "صلح محل" کیوں تھا؟

وطن پرستی

ایک اور چیز ہے جس کی تصحیح غالب کے محقق کے لئے ضروری ہے۔ یہ اصحاب اقتدار کو خوش رکھنے کا میلان ہے۔ جب تک کہ بہادر شاہ قلعہ دہلی میں منہمکن رہے اور غالب کو قلیل آمدنی سے منصب عطا کرتے رہے شاعر نے مدح و ستائش کے خوب پھول برسائے لیکن جب اسلامی ہندوستان پر بلائے عظیم نازل ہوئی اور بے کس و نامراد بادشاہ اپنی جنم بھومی سے نکال دیا گیا جہاں اس کے شوکت ناب آبا و اجداد نے صدیوں تک جہاں بانی کی تھی تو غالب نے کیا کیا دہلی کے برطانوی اچینٹوں نے اس شبہ پر کہ وہ بھی دربار سے سازباز رکھتا ہے اس کا وظیفہ بند کر دیا غالب نے اس الزام سے بھارت اور ہیشن کو واپس حاصل کرنے کی عجیب دیوانہ وار

بے سوکوششیں کیں۔ اس نے گورنر جنرل کی خدمت میں ایک
 قصیدہ گزرا نا۔ جس میں نئے دور کے خوب ترانے گائے لیکن
 بیچارے کو بڑا روکھا جواب ملا کہ بہطانیہ اب اس قسم کی مزیافت طبع کی

لے غالب کے زاویر نگاہ پر یہ باب ابتداء کوئی ڈیڑھ سال قبل عثمانیہ
 میگزین جلد (۱) نمبر ۲ میں شائع ہوا تھا جو بعد میں مسلم کرانیکل کلکتہ کے سالنامہ ۱۹۲۷ء
 میں شائع کیا گیا اس عرصہ میں غالب کی وطن پرستی کے متعلق جو خیالات میں نے
 ظاہر کئے تھے ان پر بعض لوگوں نے غور کرنا شروع کیا اور جو حضرات پہلے ہی
 سے اس خصوص میں کوئی خاص رائے رکھتے تھے وہ اس کے اظہار پر مائل ہوئے
 چنانچہ رسالہ اردو اور نگہ آباد کے فاضل مدیر نے اردو جلد ۸ نمبر (۲۲) بابت جولائی
 ۱۹۲۸ء میں غالب کی ایک تقریر شایع کی ہے جس سے میرے اس خیال کی جو ایک سال
 قبل ظاہر کیا گیا تھا تائید ہوتی ہے اس تقریر کا علم جیسا کہ فاضل مدیر کا بیان ہے
 انہیں کئی سال قبل ہو چکا تھا بہتر تھا کہ مدیر منتر اس کہ اسی زمانہ میں شایع فرمادیتے
 جبکہ وہ اذلاً ان کے دائرہ علم میں آئی اس سے غالب کی وطن پرستی کا وہ سارے شور و
 غوغا ختم ہو جاتا جو ایک عرصہ سے فضا میں گونج رہا تھا۔ غالب کی اس تقریر کے لئے
 ملاحظہ ہو ضمیمہ (۲) کتاب ہذا۔

حاجت مند نہیں۔ تقریباً تین سال بغیر پنشن اور خلعت کے بڑی عسرت میں گزارے اور اپنے احباب کی کریمانہ نوازشوں پر زندگی بسر کی ہر گھڑی اس کی دلی آرزو تھی کہ پچھلے الطاف تازہ ہو جائیں۔ کوئٹہ میں وکٹوریہ کی مدح میں جو فقیدہ لکھا ہے اس کو ملاحظہ کیجئے نیز وہ خطوط بھی دیکھئے جو اس نے اپنے دوستوں کو لکھے جن میں وظیفہ اور خلعت کی اندسہ نوا جرائی پر بے اختیار مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

اس کے باوجود غالب کے قدردانوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ بڑے وطن پرست تھا اور اسلامی اقتدار کی تباہی سے اس کے دل پر بڑی چوٹ لگی چنانچہ ذیل کے اشعار اس کے دردِ دل کے منظر بیان کئے جاتے ہیں۔

جاہ و جلال عہد وصال بناں نہ پوچھ	ہندوستان سایہ گل پایہ تخت تھا
عرض فضلے سینہ درد امتحان نہ پوچھ	ہر دماغ تازہ اک دل دماغ اشعار پر

قمری کا طوق حلقہ پیردن ہی آج
تارِ نفس کمنہ شکار اثر ہی آج

گلشن میں بند و بست بگنگ گرہ آج
آتا ہے ایک پتہ دل ہر فغاں کے ساتھ

جو اشخاص ان اشعار کو ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں کا ترجمان سمجھتے ہیں وہ شاید اس سے ناواقف ہیں کہ یہ عذر کے غالباً چالیس سال قبل لکھے گئے (ملاحظہ ہو دیوان غالب قلمی نسخہ بھوپال جو ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء میں ترتیب دیا گیا) یہ اشعار واقعہ عذر سے ایسے ہی بے تعلق ہیں جیسے کہ ذیل کے اشعار سے

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ سہ گامہ اے خدا کیا ہے

اس بارہ میں عالی صاحب کا بیان بھی سن لیجئے

”جیسا کہ ان تحریرات سے ظاہر ہے تمام عمر ملکہ معظمہ اور ولیسراؤں
لفٹنٹ گورنروں اور دیگر حاکموں اور افسروں اور تمام انگلش قوم
کی مدح سرائی میں بسر کی بعض افسروں کی وفات پر دردناک مرثیے
لکھے اور ہمیشہ فخر کے ساتھ اپنے تمہیں وابستگان دامن دولت
انگلشیہ سے سمجھتے رہے۔“

صوفیانہ رنگ

غالب کے کئی نقادوں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ بات بھی بتلائی ہے کہ وہ بڑا صوفی تھا۔ واللہ اعلم! کسی خیال کا ذہنی ادراک اور چیز ہے اور اس میں بس جانا اور بات۔ اس کے علاوہ اسے فقرے جو صوفیانہ مسلک کے حامل ہیں، غزل، گوشوارہ کی تولدت پرست دکان سخن میں غزنیہ مع وجود ہیں، دیکھیے خود غالب اس خصوص میں کیا کہتا ہے،

.. آرائش، مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف اور کچھ نجوم لگا رکھا

بے درد نہ سوائے موزونیت طبع کے بہاں کیا رکھا ہے۔

محض اس بناء پر کہ غالب کے اشعار میں صوفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں، ہمیں یہ نتیجہ نہیں نکال لینا چاہئے کہ وہ صوفی تھا جب تک کہ اس امر کا یقین نہ ہو جائے کہ اس قسم کے شعر اس کی سیرت، افتاد طبیعت اور عمل کے آئینہ بردار ہیں۔ محقق کلام غالب کو ان پر سنجیدگی سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں حقیقی صوفی وہ شخص نہیں ہے جو صرف مذہب تصوف کو مانتا ہے

بلکہ وہ شخص ہے جو اندرونی طور پر اس کو محسوس کرتا اور اپنے تمام افکار اور اعمال کو اس کے مطابق رکھتا ہے۔ ہر چیز جو موجود ہے، ہے۔ کوئی شے بے محل نہیں۔ ہر چیز بذات خود خیر ہے۔ سب اس کی مرضی و مشیت کے مطابق ہے۔ وہ اس کا عالم ہے اور اس کو معرض بحث میں لانا اس کی ذات سے انکار کرنا ہے اس سے محبت کرنا اور یہ محسوس کرنا کہ جو کچھ ہے اس کی ذات سے ہے اور خیر ہے، ایک صوفی کی اصل زندگی ہے اس کی مشیت میں چون و چرا کرنا اور تسلیم و رضا سے منہ موڑنا صوفیانہ شان کے بالکل خلاف ہے۔ غالب اور اس کے فلسفہ کا امتحان کرتے وقت محقق کو یہ باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

بعض ایسے حضرات بھی ہیں جو غالب کو کئی چیزوں کا حق دار سمجھتے ہیں جن میں اس کی "قومی رجائیت" کسی طرح کم اہم نہیں اس بحث کی تائید میں اس کے دیوان سے اشعار بھی پیش کئے جاتے ہیں جن پر محقق کو غائر نظر ڈال کر یہ معلوم کرنا چاہئے کہ ان اشعار کی نوعیت تخلیقی ہے یا خالص وجدانی۔ سکسپیر نے بیسویں بد معاش پیدا کئے، لیکن ادبیات کا کوئی ذی فہم محقق یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ خود بھی ایک بد معاش تھا۔ شاعر حالات کے سانچے میں ڈھل

جاتا ہے اور تختیل کے بل پر گونا گوں احساسات اور کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے، جن میں خود اس کی شخصیت کا کوئی رنگ نہیں پایا جاتا۔ الفاظ کا جامہ پہنتے ہی وہ شاعر کی ذات سے الگ ہو کر اپنا مستقل وجود قائم کر لیتے ہیں وہ کلام البتہ اس سے مختلف ہے جس میں بار بار ایک ہی راگنی سنائی دیتی ہو اور جس کی یک رنگی اور وضع داری سے پتہ چلتا ہو کہ وہ شاعر کی زندگی یا شخصیت ہی کے خمیر پہ تعمیر ہوا ہے۔ غالب کے زاویہ نگاہ کی جانچ پڑتال کے لئے ہمیں اسی قسم کے اشعار و غزلیات سے سروکار ہے۔ اس کی تخلیقی شاعری پر فن و کمال پر بحث کرتے وقت توجہ کی جائے گی۔

ہم نے اوپر ان نمایاں اجزاء کو بیان کر دیا ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف صورتوں میں غالب کے حیاتی زاویہ نگاہ کو ترقی دیتے رہے اب یہ معلوم کرنا محقق کا کام ہے کہ ایک جز دوسرے اجزاء پر کس طرح عمل اور رد عمل کرتا رہا لیکن اس سے جو بھی نتیجہ نکلے، اور مختلف اجزاء یعنی اندرونی اور بیرونی اثرات جس تناسب میں بھی ملے جلے نظر آئیں محقق کا اس نتیجہ پر پہنچنا یقینی ہے (بشرطیکہ وہ اعتقاد کی رو میں نہ بہ جائے)

کہ ایک عنصر باقی تمام عناصر پر چھایا ہوا ہے اور وہ شاعر کی بے اطمینانی ہے۔ اس بے اطمینانی کو ہم قبل ازیں مردم بیزاری سے موسوم کر چکے ہیں۔ لیکن آخر اس کی بنیاد کیا تھی۔ کیا یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ اس کے نزدیک دنیا ایسے نا اہلوں سے آباد ہے جو اس کے تخیل کی بلندیوں تک اس کا ساتھ نہیں دے سکتی اور اگر یہی بات تھی۔ تو اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہونا چاہئے تھا اور پھر اتنی سی بات پر مبدرفیاض سے شکوہ گزار ہونے کے کیا معنی؟ طبیعت کا یہ رنگ کہیں اس وجہ سے تو نہیں پیدا ہو گیا تھا کہ بعض قریبی عزیزوں کی وفات نے اس کی خانگی زندگی کو تلخ اور ناگوار بنا دیا تھا اگر یہ واقعہ ہے تو پھر وہ شوخی وہ ظرافت کہاں سے آگئی۔ جس کو عالی اس کا رفیق دائمی بتاتے ہیں؟ اس بے اطمینانی کا اصل سرچشمہ آخر کار کیا قرار پاسکتا ہے۔ ذیل کے اقتباس ملاحظہ ہوں۔

” میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا کچھ قدر دانی

فرمائی رو رہا یہ میں ایک غنوی جو سابق میں کھس تھی وہ محی اللہ

کو بھی، رسید بھی نہ آئی۔ ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی سوائے شہرت خشک کے فن شعر کا پھل نہ پایا۔ فرمان وہاں عصر ہے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔

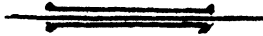
”جو علی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جاتا ہوں۔ زلیت بر کرنے کو کچھ توڑی راحت درکار ہے، اور باقی حکمت و سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہیں۔ ہندوستان میں کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گستاخے تو کیا کچھ دوجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی باقی صعب و ہم“

”انوری نے بارہا ایسا کیا کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا میں نے باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام پر کر دیا تو کیا غضب ہوا۔ اور پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں۔ اس قصیدہ سے مجھ کو عرض دست گماہ سخن منظور نہیں گدائی منظور ہے۔“

”حضرت زبیدۃ العلماء کا اب تک دہاں نہ پہنچنا تعجب کی بات ہے حق تعالیٰ ان کو جہاں ہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے جب

چائیں وہاں پہنچیں۔ میرا مقصود تو اتنا ہے کہ قصیدہ گزرے اور
کچھ ہمارے تمہارے ہاتھ آئے۔

ایسے بیسیوں اقتباسات دیئے جا سکتے ہیں بہر حال اس
واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب میں عظیم الشان قوتیں ودیعت
کی گئی تھیں لیکن صبح ہم خدا خواہی وہم دنیاے دُنیا کے بمصداق
نہ تو اس کو وہ چین اور سکون ہی نصیب ہوا۔ جس کا وہ اس قدر آرزو مند
تھا اور نہ وہ امتیاز ہی حاصل ہو سکا جو اس کے اعلیٰ قابلیتوں
کے مطابق ہوتا۔



باب ششم

پر عظمت شاعری

”اگر تو واقعی قدرت کے نذرانی سرچشمہ سے فیض اٹھاتا ہے
 تو اے خاعر! اٹھ اور خدا کے دیئے ہوئے نور کے مطابق اپنے مقام
 پر جلوہ گستر ہو اور رہنِ تناعت ہو جا۔“

”قوی ہو مکیں ستارے اور وہ جو تہائے بلندی سے نور برساتے ہیں
 و گو صرف آدمی دنیا ان کو دیکھ سکتی ہے اور بقیہ نعمت عالم صرف
 ان کے وجود کا علم رکھتا ہے | اس تہا ستارے سے زیادہ لطیف
 اور حامل شان الہی نہیں۔ جو کسی بھیانک پہاڑ کی چوٹی پر آپ ہی آپ
 روشن رہنے والے شعلہ ہدایت کی طرح فروزاں رہتا ہے“

” اور نہ ان ننھے ستاروں سے، جو بے برگ و بار درختوں کی ٹہنیوں میں موسم سرما کی جھلک لاتی شمعوں کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔“

” یہ سب ایک ہستی واحد کے غیر فانی چشمِ دجراغ ہیں۔“
 ” تو کپڑے شاعر! اٹھ اور خدا کے دیئے ہوئے نور کے مطابق

اپنے مقام پر جلوہ گستر ہو اور زمینِ قناعت ہو جا۔“ (در ڈسورتہ)

در ڈسورتہ کی تباہی ہوئی یہی وہ ربانی تجلی ہے جو شاعری کی جان ہے۔ خدا کی یہ دین کسی کو زیادہ نصیب ہوتی ہے تو کسی کو کم بعض قومی ہیکل ستاروں کی آن سے جگمگاتے ہیں تو بعض بے برگ و بار درختوں کی شاخوں میں، سرما کے ٹمٹماتے ستاروں کی ہتک تابی کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ بہر صورت ہر شخص بشرطیکہ وہ واقعی شاعر ہو، ایک ہی سرچشمہ سے اکتساب نور کرتا ہے۔

یہ نور شاعر کے دل و دماغ کو اپنا بسیرا بنا لیتا ہے۔

جہاں وہ مادرانہ محبت سے اس کو پالتا پو ستار ہوتا ہے۔ اس تاریکی کو دور کرتا ہے جس میں ذہن انسانی گھرجاتا ہے اور پھر اس کو رازِ زندگی کے سمجھنے کے قابل

بنا دیتا ہے۔ لیکن بہر شاعر اس مانتا بھری پرورش اور تربیت کو قبول نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ پر عظمت شاعری کا راستہ بڑا کٹھن اور دشوار گزار ہے بعض خدا کے بندوں کو عمر بھر اس نور کا احساس نہیں ہوتا بعضوں پر تاریکی کے اتنے گہرے پردے پڑ جاتے ہیں کہ وہ اس بجلی سے بہر اندوز ہی نہیں ہو سکتے۔ زمرہ اول کے شعراء شعر تو کہتے ہیں۔ لیکن اس کا رتانی پہلوان کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے اور انہیں اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ زندگی میں اس کا کیا حصہ ہے۔ وہ زندگی میں لطف ضرور اٹھاتے ہیں لیکن ان کی لطف اندوزی، ایک بچہ کی خوشی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اس میں وہ اہمیت کا کوئی خاص سامان نہیں پاتے۔ بسنتی گلاب ان کی نگاہوں میں ایک نظر فریب زرد رنگ کا پھول ہے۔ اور بس۔ ایسے شاعر اپنے حال میں خوش رہتے ہیں اور انہیں آگے کی طرف قدم بڑھانے کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ دوسرے زمرہ کے شعرا گویا طفلانِ ظلمت ہیں ان میں اگر کوئی اظہار خیال پر قادر بھی ہوتے ہیں تو وہ قدرت کے اس عطیہ کو انسان کے کثیف جذبات کی ترجمانی میں صرف کر ڈالتے ہیں۔

بعض ایسے بھی ہیں جنہیں اس تجلی کا سپاس گزارانہ احساس ہوتا ہے وہ اس سفر کے لئے کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں جس کی آخری منزل خدا کی بستی ہے۔ یہاں وہ اس ہم آہنگی کا تماشادیکھنا چاہتے ہیں جس کو وہ اندر ہی اندر محسوس کرتے رہے ہیں اور جس کی نورانی کرنیں چھن چھن کر تمام عالم میں بھلتی رہتی ہیں لیکن ہر کوئی اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا اپنے اپنے ظرف نور کے مطابق ہر شخص زور لگاتا ہے بعض اپنے پیمانہ نور کے ختم ہوتے ہی راستہ میں رہ جاتے ہیں اور بعض باوجود اس کے قدم آگے بڑھا کر تاریکی میں گم ہو جاتے ہیں بعض اس ظلمت یعنی »زندگی کے خوفناک ہجوم غم« سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ انہیں کچھ نہیں سمجھائی دیتا۔

۔ امید کا آسرا اور تاب و توان کی نعمتیں، میں کہوں
 سے لاؤں۔ دل میں طوفان اضطراب اور عالم خارج میں ایک
 ہنگامہ بپا ہے۔

قناعت کی دولت بیدار بھی میرے مقسوم میں نہیں جس کو
 اہل حال اپنے مراقبوں میں ڈھونڈھ پاتے ہیں اور اس شان سے
 نکلے ہیں کہ روحانی فتح کا تاج ان کے ذریعہ سر ہوتا ہے۔

” شہرت و اقدار اور محبت و آرام کی لذتوں سے میں نا آشنا ہوں وہ لوگ ایک ایک کر کے میری نظر کے سامنے ہیں جو ان چیزوں میں بسے ہوئے ہیں۔ ہنس بول کھجیتے اور زندگی کو سادہ عزت سمجھتے ہیں لیکن کیا بتاؤں کہ مجھے قدرت نے زندگی کے اور ہی گھونٹ پلانے! اب یاس و حرماں ہوا اور پانی کی طرح میرے لئے نرم اور شیریں بن گئے ہیں۔ ایک نکلے ہوئے بچے کی طرح میں اس جنجال کی زندگی کو رد کر اپنے آنسوؤں سے بہا سکتا ہوں تا آن کہ موت دے پاؤں نیند کی طرح مجھ پر چھا جائے ہو انکی گرمی میں میرے گال ٹھنڈے پڑنے لگیں اور سمندر کی آخری تان میری مائل بہ پرواز و اندر درج پر ٹوٹ جائے،“ (شیلی)

سمندر کی یہ تانیں آخری نہیں بلکہ ابدی ہے!

ان اسیران رعب میں سے بعض اٹے پاؤں جہاں سے چلے تھے وہیں آ رہتے ہیں۔ ذرا عقل ٹھکانے لگتی ہے تو اپنے المناک تجربہ پر بخور کرنے لگتے ہیں۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ایک معما ہے، لیکن تسکین کی صورت نکالنی بھی ضروری ہے۔ اس لئے وہ فکر و تخیل کی ایک مثالی دنیا میں پناہ کھنڈیں ہو جاتے ہیں۔

چند ایسے بھی ہیں جو اپنے «نور» کو مدہم بڑھاتا دیکھتے ہیں
 نوان کا دل بیٹھ جاتا ہے لیکن پھر اس خیال سے ڈھارس بندھتی
 ہے کہ آخر اوروں نے اس منزل کو جا ہی لیا۔ اس بناء پر وہ
 محسوس کرتے ہیں کہ اگر اور نور ان کے حصہ میں آ گیا تو وہ بھی اپنے
 مقصد کو پالیں گے وہ آگے بڑھ کہ خطرہ میں پڑنا نہیں چاہتے
 اور نہ ان کے قدم پیچھے کی طرف پلٹتے ہیں کیوں کہ ادب باب
 بازگشت کے مقابلہ میں انہیں زیادہ "ذوق یقین" حاصل
 ہوتا ہے وہ ستم کش امید و انتظار رہتے ہیں۔

" اے دوست۔ دیکھتا! تیری اور ہماری زندگی میں
 کتنا بے فرق ہے۔ ہم ہیں کہ بغیر کسی مقصد و غشاء اور احساس
 وقت کے بے چلے جا رہے ہیں ہر شخص کو شش میں مصروف
 ہے لیکن اس کے مال سے نا آشنا۔ وہ سونگ کی زندگی بسر
 کرتا ہے۔ لیکن ہر زندگی ادھوری۔ تیری طرح جو انتظار بھی
 رہتا ہے۔ لیکن اس میں تیری سی شان امید واری
 کہاں۔"

" تو جلوہ طور کا خطرہ ہے اور ایک ہم بھی ہیں جو عارضی مقبول
 کے نیم پرستار ہیں جن کے احساس میں گہرائی اور اردوئی میں صفائی

نہیں جن کی بصیرتوں نے عمل کے پھل نہیں چکھے اور دھندلے خواب و خیال تکمیل سے بے نیاز رہے۔ جنہیں ہر سال نئے غم اور نئے سامان دیئے جاتا ہے۔ جو اپنی زندگی کو تذبذب میں گوا دیتے ہیں اور آج کی کمائی بے دردی سے کل لٹا دیتے ہیں۔ سچ بتانے کا وہ بدوش ! کیا ہم اس نور کے انتظار میں نہیں بیٹھے رہے ؟

ہم بے شک بلاکش انتظار میں لیکن وہاں مجاب ہے اور یہاں در ماندگی پھر ہم میں کا وہ شخص جس نے سب سے زیادہ در ماندگی کے مزے چکھے ہیں بیزار اور ہراساں ہو کر عقل کے تحت پر ممکن ہوتا ہے۔ ایام غم کے تمام تلخ تجربوں کو ایک ایک کر کے بے نقاب کرتا ہے اور جی کے جنجال کے آغاز و ارتقار اور نشانات کی ساری کہانی بیان کرتا ہے اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ امید کے بھنے والے شرارے کو وہ کس طرح چمکانا رہا پہلو میں دل کو سمجھاتا اور اُدھر عقل کی فہمائش کرتا رہا۔ غرض وہ گھڑی گھڑی کی تسلیوں کا ایک دفتر کھول دیتا ہے۔

لیکن یہ صرف ارباب عقل کا شیوہ ہے۔ ہمارے حصہ میں تو پچھتا نا کھا ہے۔ ہم آرزو کرتے ہیں کہ جلد ہمارے خواب

پریشاں کا خاتمہ اور رحمتوں کا نزول ہو۔ ہم دم بخود ہو کر
صبر کے ساتھ سب کچھ سہے جاتے ہیں۔ تلخی صبر بھی کیا بلا ہے
گویا نامرادی کی دیوار سے ٹکی کھڑی ہے۔ لیکن اے دوست!
کسی میں بھی امید کی وہ شان نہیں پائی جاتی جو تجھ میں
ہے۔ (آرنلڈ)

ان میں سے بعض فضول انتظار کشی کی زحمت میں مبتلا
رہتے ہیں پھر بھی وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔
”ہاں اب بھی ہم امیدوار ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر حال
میں شر کی آخری منزل، خیر ہی ہے۔ ضمیر کی ملامتیں، ادا
کی نغز نشیں، دل کے دوسے اور طبیعت کی خامیاں خیر ہی پر ختم
ہوں گی۔“

”کوئی چیز بے مقصد جادہ پیا نہیں۔ حیات کی کوئی چھینٹ
منسوخ نہیں جائے گی اور نہ وہ بے کار سمجھ کر سپردِ علم
کردی جائے گی۔ جبکہ خدا نے یہ کارخانہ مکمل
بنایا ہے۔“

”پتنگے کی ننھی سی جان بھی یوں ہی وجود میں نہیں آگئی اور
نہ جگنو بغیر کسی مقصد کے نور کی بے محل چنگاری اپنے ساتھ

لئے لئے پھرتا ہے۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ مآل حیات رکھتے ہیں
یا کسی اور عامل مقصد کی خدمت گزار ہی میں معروف
ہیں۔

”دیکھنا! ہر چیز ہماری نگاہوں سے مستور ہے، لیکن میرا
ایمان تو یہی ہے کہ منزلوں دور ہی سہی انجام کارہ خیر۔“
ہمارے گلے کا ہار بنے گا۔

”یہ ہے لڑھی میرے خواب کی لیکن خود میرا کیا حال ہے۔
میں ایک بچہ کی طرح رات کی تاریکی میں نور کے لئے بلبلا
رہا ہوں جس کے بس میں سوائے اس رونے کے کوئی اور
بیستہ نہیں۔“

صرف چند ہی افراد ہیں جن کا سفر بالآخر انجام کو پہنچتا ہے
یہی وہ لوگ ہیں جو زندگی بلکہ کل کائنات کی زندگی کے احساس
ہم آہنگی سے لذت آشنا ہوتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقی معنوں
میں بڑے ہوتے ہیں بلا لحاظ اس کے کہ معاشرت میں ان
کا کیا رتبہ ہے۔ مانا کہ وہ شاعر نہیں اور شاعرانہ اظہار کی
قوت بھی نہیں رکھتے۔

”میں اس دربار میں ہوں جہاں اعلیٰ خیالات کی خوشی مجھے رہ رہ کر

گدا گداتی ہے۔ وہ حسن لطیف مجھ سے ہم کنار ہے جو کسی گہری چیز سے لبریز ہے۔ ڈوبتے سورج کی کہنیں، سمندر کی موجیں، جیتی جاگتی ہوا اور انسان کا کاسہ دماغ اس کا نشیمن ہے وہ کوئی بیتیاب سخی چیز ہے جو ہر ذی ہوش اور ہر پیکر خیال میں اور کامیاب کئی ہر شے میں سمائی ہوئی ہے۔

یہ چیزیں بعضوں کو ایمان و ایقان سے حاصل ہوتی ہیں اور بعض غور و فکر یا ایمان و غور دونوں سے حاصل کرتے ہیں۔

”اور کہا ہر کے اس چاک کو دیکھنا۔ کیسا بلیغ استعارہ ہے! غور تو کہہ دو کہ گہر دش ایام میں ایسی تیزی کہاں سے آگئی اور یہ مٹی کا ڈھیر اس کے ہاتھوں کیسے مجبور اور بے بس ہو گیا کبھی اس زند خراب حال کی اس بات کو بھی تو نے کافی دھر کہہ سنا کہ زندگی ایک چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ ہر چیز پابند تغیر ہے۔ ماضی تو چل بسا۔ اب حال کو تو کم از کم اپنا بنا لے۔“

”نادان انسان! جانتا بھی ہے کہ جو ہر حیات کو بقائے دوام حاصل ہے۔ ماضی اپنی داستانیں دہراتا رہے گا اور مین

یکجلیاں بدلتی رہے گی۔ لیکن خدا اور تیری روح ایک حقیقت محکم ہے تجھ میں جو چیز سماگئی وہ پہلے بھی تھی، اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی زمانہ کا چاک خواہ رک جائے یا پیچھے کی طرف دوڑنے لگے کہہ رہا اور اس کی مٹی کو بقادِ عامل رہے گی۔»

• اس نے تجھے موم سے نازک ماحول کی آغوش مضطرب میں دے دیا تیرا چہی تو بہت چاہتا ہو گا کہ زمانہ کی چال کو اپنی مٹھی میں بند کرے لیکن جانتا بھی ہے کہ اس کا منشاء کیا ہے۔ یہ تیری روح کی سنوار کا ایک آلہ ہے جو جی بھر کر تیرے نقش و نگار بنانا اور آخر کار تکمیل کے روپ میں تجھے ڈھال نکالنا ہے۔

» گم و شام میں اگر شباب کی سرستیوں اور عاشقانہ رموز کے دل نشین جلوے پیش نظر نہ ہوں تو کیا مضائقہ۔ اب اگر بڑھاپے کے ڈراو نے منظرِ نگاہِ عبرتِ مین کے سامنے آجاتے ہیں تو کیوں ڈراتا ہے، تجھے ان جمیلیوں کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا۔»

» ذرا اوپر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ کہ آخر اس ساحر کا معرفت کیا ہے۔ جو فانی کی رنگین محفلوں کو بے لبا بھی دے۔ نئی

شراب اُبل اُبل کر کف آلود ہو رہی ہے اور آقا، کا چہرہ
فروغِ حق سے گلستان بنا ہوا ہے تو خاص دستِ قدرت کا
بنایا ہوا۔ ایک مکمل ساغر ہے تجھے زمین کے اس
چاک سے کیا واسطہ۔»

» اے خالقِ کار ساز تو اب بھی ہم غریبوں کا بلجا و ماویٰ
ہے زندگی کے طوفان اور عالمِ رنگ و بو کی ہر منزلِ حیات میں
میں نے تیرا دامن نہیں چھوڑا مقصد آفرینش کو کبھی دل سے
نہیں بھلایا اور ہمیشہ تیری لومیں لگا رہا۔»

» اب یہ تیری دستِ کاری تیرے حضور میں پیش ہے تو
اسے ذرا ٹھونک بجا کر دیکھ لے۔ اگر کچھ بل رہ گیا ہو تو اسے
نکال دے اور اگر تیرے منشاء کے خلاف اس میں کوئی حس و
فاشاک آگئے ہوں تو ان سے پاک کر دے۔ میرا پیمانہ حیات
تیرے ہاتھ میں ہے تو اسے اپنی مشیت کے مطابق صورت
تکمیل عطا فرما۔»

» خدا کرے کہ بڑھاپا جوانی کا خیر مقدم کرے اور موت اس کو
تکمیل کا آخری پیغام بنا دے۔» (بروننگ)

جب ایسی ہم آہنگی حاصل ہو جاتی ہے تو انسان کا ذہن
 ”حسین پکیروں کی جلوہ گاہ“ بن جاتا ہے اور اس مقام پر شاعر
 ایک خاص کیفیت میں چور ہو جاتا ہے۔

” وہ کیفیت مسعود جس میں اس پر اسرار کائنات کی گرائیلا
 ہلکی پڑنے لگتی ہیں یہ وہ لطیف کیفیت ہے جس میں محبت، نرمی
 و نراکت سے ہمیں آگے بڑھانے جاتی ہے تا آن کہ ہمارا پیکرِ خاکی
 سہم جاتا ہے۔ اور اس کے خون کی گردش رک جاتی ہے۔
 جمائی مشیت سے ہم سو جاتے ہیں لیکن ہمارا روح بیدار
 ہو جاتی ہے۔ ہمارے دیدہ منتظر کو ہم آہنگی کے تاشے اور
 مسرت کے بھرپور جذبے سے سکون و قرار حاصل ہوتا ہے پھر
 کائنات کے سارے حجاب چاک ہو جاتے ہیں۔ “

انسان کا ذہن جب یہ شان اختیار کر لیتا ہے تو وہ
 اپنے لطف و تفکر کی خاطر تمام کائنات کو اپنی آغوش
 میں لے لیتا ہے۔

” مجھے کبھی دھندلکے میں بساط زمین پر چلنا پڑتا ہے۔ اور
 کبھی ڈوب کر انتہائی گہرائیوں میں جانا پڑتا ہے جہاں فلک
 الافلاک بھی ایک حجاب معلوم ہوتا ہے۔ پت و بلند کی اس

سیر میں کہیں قوت و جبروت، اور کہیں خوف و دہشت شکل
 و صورت کے مہیب پودوں میں نظر آتے ہیں جن کا نظور
 کبھی اجتماعی شان میں ہوتا ہے اور کبھی انفرادی۔ یہودیوں
 کا خدائے قہار اہل شور و فرشتوں کے اکھاڑے میں کس جلال
 سے گر جتا رہتا ہے لیکن میں ان سب سے بلا کھٹکے گزر
 جاتا ہوں کوئی حالت انتشار میرے دل میں خوف نہیں
 پیدا کرتی۔ جہنم کا سب سے تاریک اور اسفل طبقہ اور
 عالم رویا کا بعبیانک سے بعبیانک مقام مجھے خوف زدہ
 نہیں بنا سکتا۔ لیکن جب میں اس زمین انسانی پر نظر
 ڈالتا ہوں جو میرا نشین اور میرے نعروں کی حقیقی بستی
 ہے تو میرا دل مارے خوف کے دھڑکنے لگتا ہے۔“

ذہنی فطحتندی کی یہ قوت خاص لوگوں کا حصہ ہے۔ کسی
 خاص صنف سخن میں یا کسی خاص مقدار میں عظمت حاصل
 کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس صنف یا مقدار
 میں کوئی کمال حاصل کیا جائے۔

شاعری میں احساس ہم آہنگی پر زور دینے سے ہمارا
 ہرگز یہ منشاء نہیں ہے کہ شاعر اپنی شاعری التزاماً اس کا اظہار

کرتا رہے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک آن کی مہرت یا احساس کی توجہ جانی کرے اور چپ ہو رہے۔ کوئی شخص محض اس بنا پر اس کو شاعروں کی... صنف سے جدا نہیں کر سکتا کہ جن چیزوں کو وقتاً فوقتاً محسوس کرتا رہا یا جن سے وہ محفوظ ہوتا رہا ہے وہ ان کی تنظیم یا تعبیر نہیں کرتا لیکن اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ شاعروں میں اس کو کیا درجہ حاصل ہے تو لامحالہ اس کو ایسے شاعر کے مقابلہ میں کم درجہ دینا ہو گا جو نہ صرف اپنے تجربات سے محفوظ ہو ہو بلکہ ان پر غور و خوض بھی کرتا رہا ہو۔ نیز اپنے ذہن میں "ہم آہنگی" کا ایک احساس پیدا کر لیا ہو۔ جس کی روشنی میں وہ اپنے سارے تجربات کی جانچ پڑتال کر کے ایک "انتہائی کوشش" میں اس کو عالم گیر اور مثالی قالب عطا کرتا ہے۔

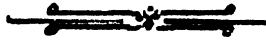
یہ انتہائی کوشش شاعری کا ایک تعین کن جزو ہے کہ کوئی شخص ایک بڑے احساس ہم آہنگی کے زیر اثر ایک بڑا شاعرانہ تجربہ محسوس کرے۔ لیکن تا وقتیکہ یہ تجربہ بصورت الفاظ اعلیٰ شعری روپ میں ظاہر نہ ہو ہمیں اعلیٰ قسم کی شاعری نہیں حاصل ہو سکتی۔

اس "انتہائی کوشش" کے لئے ضروری ہے کہ ایک انتہائی گھڑی بھی نصیب ہو اس وقت گویا شاعر کی زندگی کے تمام تجربات گھل مل کر ایک ایسے جامع تجربہ میں سما جاتے ہیں جو تمام تجربات کی جو باس لئے ہوئے ماورائی شان اختیار کر لیتا ہے۔

ایک شاعر طرح طرح کے تجربات محسوس کر سکتا ہے اور ان میں کا ہر تجربہ اس کے ذہن کے ایک پہلو کا آئینہ بردار ہو سکتا ہے۔ اس پہلو کی تتر جانی بجائے خود موثر اور خوش گو اور ہوشگستی ہے لیکن ہر ایسے اظہار میں عظمت کا پایا جانا ضروری نہیں۔ مثال کے طور پر ورڈز ورس درتھ کو لیجئے اس نے بہت سی نظمیں لکھیں لیکن ہر نظم میں اس کی عظمت کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس کی بعض نظمیں بے انتہا خشک ہیں "اکسکریشن، "سیر" میں جو شاعر کی ایک واقعی کوشش کا نتیجہ ہے۔ ایسی بے شک نثر کے نمونے ملتے ہیں جو صرف بحر کے سانچے میں ڈھال دیئے گئے ہیں اس قسم کی کوتاہیاں کسی طرح بھی شاعر کے اس کمال کو نہیں چھین سکتیں جو اس کو "اودان امارٹیا لٹی" (نغمہ بقا) جیسی نظموں میں حاصل ہوا ہے اس قبیل کی نظموں میں شاعر کا جامع تجربہ

کار فرما ہے۔ اعلیٰ گھڑیاں انتہائی گھڑیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور اعلیٰ نمر ایک اعلیٰ نغمہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

اس طرح ایک بڑا شاعرانہ تجربہ بڑھتے ہوئے احساس ہم آہنگی سے شیر و شکر ہو کر اعلیٰ شعر کی صورت میں ٹپک پڑتا ہے اور یہی شاعر کو ایک بڑے شاعر کے درجہ پہ فائزہ کرتا ہے اب ہم پھر غالب کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔



باب ہفتم

غالب کی شاعری

کلام غالب کا اگر غور سے معالجہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو گا کہ اس کا اصلی رنگ فزہنی اور دماغی ہے۔ زندگی بھر شاعر کی یہ آرزو رہی کہ وہ فکر و اظہار میں اچھوتا معلوم ہو۔ اور ایک لحاظ سے اس کا یہ مقصد پورا بھی ہوا۔ لیکن اس سے اس کی شاعری ماری گئی اس کے اردو کلام میں شاعری سے زیادہ فن بلکہ صنعت گری نمایاں اور احساس سے زیادہ فکر و تخیل یا خیال آرائی کے آثار پائے جاتے ہیں جہاں احساس کے نشان پائے بھی جاتے ہیں وہاں عقل کا رنگ چڑھانے کی محسوس کوششیں ظاہر ہوئی جاتی ہیں۔ حال کی اردو تنقیدوں نے غالب کو عجیب و غریب قوتوں سے

مالا مال کر دیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شاعرانہ لطف کی خاطر وہ تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔

• لوح سے تمت تک مشکل سے غنوا صفحے ہیں لیکن کیا ہے

جو یہاں حاضر نہیں ہے کون سا نغمہ ہے جو اس سا زندگی کے

تاروں میں بیدار یا خوابدہ موجود نہیں ہے۔

یہ چیز رہ رہ کر فضا میں گونجتی رہتی ہے۔

رہا دیوانِ افسانہ کی کہانی سیدھی سادھی ہے۔ ہر زمانہ میں

غزل گو شعرا نے شیخ و نبیہن کی پھبتیاں اڑائیں صوفیوں اور

فلسفیوں کی شان اختیار کی۔ فلک پر شکایتوں کے تیر بہ سائے

اپنی شاعرانہ برتری کے گیت گائے۔ عاشقی کا سوانگ بھرا۔

ساغر کے دور چلائے اور اسی قسم کے بہت سے تماشے کئے

غالب نے اس پامال راستہ سے کچھ زیادہ کنارہ کشی نہیں کی

وہی پرانے موضوع اس کو اپنی شاعرانہ جولانی کے لئے

ہاتھ آئے البتہ ان پر اس نے عقل کے نئے پردے ڈال دیئے

اگر اس نے کوئی نئی زمین تلاش بھی کی تو وہ یاس و حرمان کی

زمین تھی۔ نئی زمین تلاش کرنے سے ہمارے یہ مراد ہے کہ

حرمان لغیبی کے پہاڑ نے موضوع نے اس کی اندرونی

بے اطمینانی سے ایک شخصی رنگ اختیار کر لیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ الگ کھڑا ہوا نظر آتا ہے اور ایک ایسے شخص کی تصویر پیش کرتا ہے جو زندگی کے ماوی پہلو سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ لیکن حالات اور دنیاوی خواہشات پر مسط ہونے والی دیویاں اس کی راہ میں حائل ہیں۔

کلام غالب تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہو سکتا ہے جو رسمی طرز میں علامیہ ذہنی مشق کا نتیجہ ہیں۔ یہی وہ بلند پروازیوں ہیں جو غزل گوئی کا میدان جیتنے کی خاطر شاعر نے دکھائیں اور جن کا ذکر حالی نے یادگار غالب میں کیا ہے۔ یہاں شاعر غزل گوئی کے وہی پرانے ڈگر سے گزرتا نظر آتا ہے۔ وہ کبھی پھبتیاں اڑانے میں مصروف ہے تو کبھی عاشق کے زوہ میں جلوہ گر ہے۔ کبھی عموماً بنتا ہے اور کبھی فلسفی۔ خرض کبھی کچھ بے ادب کی کچھ۔ لیکن چونکہ وہ جدت طرائفی پر تلا ہوا ہے اس لئے اپنے ہر قسمی پہلوئے سخن پر عقلی قبائلیتیں

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تھریر کا
کاغذی ہے پیرینا ہر سپیکر تصویر کی
کاؤ کا دِ سحت جانی ہلے تہنہائی نہ پوچھ
صحیح کمرہ ناشام کا لانا ہے توئے خیر کا

جلیبے اختیار شوق دیکھا چاہئے سینہ شمشیر سے باہر ہے دم غم شیر کا
آگہی۔ دام شنیدن جن کو چاہیے بچھائے مدعا عقاب ہے اپنے عالم تقریر کا

بس کہ ہوں غالب میری میں بھی آتش زریا

موتے آتش دیدہ ہے۔ حلقہ میری زنجیر کا

تکوش ہے سزا فریادی بے داد دلہر کی مبادا خندہ دندان ناہنجیح محشر کی
رگ لیلیٰ کو اک دشت جھون ریشمی بختے اگر بوجھ جائے دانہ۔ دہقان لوگ نشتر کی
پر پر روانہ۔ شاید بادبان کشتی مے تھا ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دہانہ کی
کہوں بے داد ذوق پر فشانی عرض کیا قدرت کہ طاقت اگر گئی اڑنے سے پہلے میرے شہر کی

کہاں تک رزوں اس کے خمیہ کے پیچھے قیامت تک

میری قسمت میں یارب کیا نفعی دیوار پتھر کی

ہے عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل یک جہاں زانو تامل در قفلے قندہ ہے
کلفت افسردگی کو عیش بے تابی تروام ورنہ زندان درد لافرن بن باخندہ ہے

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن

دست مرہون چنا، رخسار زہن غانہ تھا

دوسرے حصہ کے اشعار ایسے احساسات کے ترجان ہیں جو
ذہن شاعر کے لئے نیم محسوس تھے اور اس کے مخصوص حیاتی
زاویہ نگاہ کی پیداوار، جن کو وہ یا تو رسمی لفظیات کا جامہ پہنانا ہے

یا ان کے لئے رنگ برنگ کے لفظی تزکیوں تراشا ہے
شوق ہر رنگ قیب ہر دسامان نکلا
قیس تصور پی کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

کیوں گردش دمام سے گھرانہ جاگول
انسان ہوں پیالہ دماغ نہیں ہوں میں

و اے داں بھی شور مچانے نہ دم لیندیا
ے گیا تھا گوڑ میں ذوق تن آسانی مجھے

کہتا ہے کون نالہ بلبل بے بے اشمہ
پردہ میں گل کے لاکھ گلبرگہ پاش ہو گئے

غم دنیا سے گر پائی ہے فرصت اٹھائی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اگا ہے گھر میں ہر سو بترہ ویرانی تاشا کر
مدار اب کھودنے پوگھاں کے پیر دربان کا

دوست غم خماری میں میری سہی فرمائے گیا
زخم کے بھرنے تکناخن نہ بڑھ جائینگے کیا

خانے پائے خزان ہے بہار گریبے بھی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

خفا تعلیم درس بخودی بول اس نہایت سے
کہ محزون لام الف لکھتا تھا دیوار و بستان

خلخ غمزہ خون ریز نہ پوچھ دیکھ۔ خوننا بہ نشانی میری
 تیرے صفحہ کے اشعار ایسے احساسات سے بھر پور ہیں جن کو
 شاعر نے پوری طرح سے محسوس کیا ہے اور جن پر ایسا گہرا شخصی
 اثر چھایا ہوا ہے کہ شاعر ان کو کسی پر تکلف صنعت گری سے باہر جوں
 نہیں کرتا۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر تو ا وقت سفر یاد آیا

عوض نیا نہ عشق کے قابل نہیں رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

پہلے آتی تھی حالِ دل پہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

تھی وہ ایک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں

تم اپنی شکوہ کی باتیں کہو وہ کہو مجھے دل چاہیے غم کو میرے دل سے کہ اس میں لگے بی بی

خوشی میں نہاں غموں گشتہ لاکھوں آرزو میں چہ باغِ مردہ ہوں میں بے زباں گو زبیراں کا

کہتے کس منہ سے ہو غربت کی حکایت لے تم کو بے مہر ہی یاران وطن یاد نہیں

سننے نے بے مجھ نے ناامید کی کیا تھی
کہ داناںِ خیال یا چھوٹا سا بچہ مجھ سے

نیند اُس کی ہر دماغ اسکا ہر تڑپ اس کی ہیں
عمری زلفیں جس کے بازو پر پیشاں ہو گئیں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھنے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

عمر بھر کا تو نے پیمان و قابا بندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پانداری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھینا لقا خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پہ پڑی اسی ہائے ہائے

گوشِ محرومِ پیام و چشمِ محرومِ جمال
ایکے ل تپہ زینا امید واری ہائے ہائے

خاک میں ناموس پیمانِ محبت مل گئی

اٹھ گئی دنیا سے راہِ وزہم ہاری ہائے ہائے

یہی وہ حصہ کلام ہے جس پر خالص و جدانی شاعری کا اطلاق

ہو سکتا ہے کیوں کہ زبان کے قالب میں جو شاعرانہ تجربہ جھلک رہا ہے اس کو حقیقی طور پر شاعر نے محسوس کیا پہلے حصہ کی طرح اس پر نہ تو عقلی رنگ چھایا ہوا ہے اور نہ دوسرے حصہ کلام کی طرح خیال آرائی کا رنگ غالب۔

اس میں شک نہیں کہ کلام غالب کے کامل مطالعہ کے لئے ہر حصہ کلام کا اندازہ ضروری ہے لیکن ہماری دلچسپی شاعر کے ہر حصہ کلام کے ساتھ بدلتی رہے گی جہاں تک رسمی حصہ کلام کا تعلق ہے۔ ہمیں شاعر کے کمال فن کا اندازہ کرنا ہو گا جو ذہنی یا تکنیکی طور پر ان بنے بنائے احساسات کو پیش نظر کرتا ہے جو اس کے ذاتی تار و پود سے تعلق نہیں رکھتے۔ دوسرے حصہ کلام میں جہاں احساس سے تفتن یا ذہنی شوخیوں کا دکھائی گئی ہیں۔ خالص وجدانی شاعرانہ تجربہ سے زیادہ لفظی جادو کو نمایاں اور ممتاز ہے۔ آخری حصہ درحقیقت خالص شاعری کا ترجمان ہے۔ جیسا کہ ہر ارتقائی محل کا تقاضا ہے، اس حصہ کے ہر شعر میں، صورت شعر باطنی شاعرانہ تصور سے میل نہیں کھاتی۔ لیکن پھر بھی بحیثیت وجدانی شاعر کے اس کا کمال نہیں ظاہر ہوتا ہے۔

جو لوگ کہ غالب جیسے رسمی اور وجدانی شاعر کے کلام کو ہمارے مجوزہ حصوں میں تقسیم کرنے کے عادی نہیں ہیں وہ اس کے اشعار کو مختلف حصوں سے چن لیتے ہیں اور اپنے ذہن میں شاعر کی عجیب و غریب تصویر جلوہ گر کر لیتے ہیں۔

ذیل کے اشعار بہت سے معصوم دماغوں میں ہیجان پیدا کر دیں گے پھر ایک شور اٹھے گا کہ یہاں نہ صرف فلسفہ بلکہ ایک عظیم فلسفہ موجود ہے۔ جو فلسفہ کی تاریخ میں اب تک کسی پر روشن نہ ہوا تھا۔ لیکن کیا واقعی ان اشعار میں فلسفہ یا کوئی نئی چیز ہے؟

ہے پرے سرحد اور اک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے اُدھر ہوتا کاش کے کمال پنا

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستی اشیا میرے آگے

ایک کھیل ہے اور نگیلیاں میر نزدیک ایک بات ہے اعجاز میجا میرے آگے

ہے پرے سرحد اور اک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

یہ شعر زیادہ سے زیادہ ایک لفظی کھیل معلوم ہوتا ہے جو تصور
 اس میں پیش کیا گیا ہے وہ بہت ہی معمولی قسم کا ہے اتنا معمولی کہ
 دشمن اور شیو کی صورتوں اور ان کے گونا گوں مظاہر کے بے علم
 پرستار بھی ایسے تصور کے حصہ دار ہیں۔ ہر صورت ایک علامت
 ہے کسی چیز کی جس کو مادی پیراہن میں ظاہر کرنے کی کوشش کی
 گئی اور ہر بے جان صورت اشارہ کرتی ہے کسی ایسی چیز کی طرف
 جو جان دار ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے پرے ہونا کاش کے کماں اپنا

بتلایے اس شعر میں کون سا فلسفہ ہے۔ اگر حیدرآباد سے کسی
 شخص کو لندن جانے کے وسائل حاصل ہو جائیں اور وہ وہاں پہنچ
 کر سنیٹ پال کی سب سے اونچی چوٹی پر جا بیٹھے تو وہ یقیناً قدیم
 لندن کی سرزمین پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکے گا۔ لیکن اصل
 مرحلہ تو یہ ہے کہ پہلے وہ لندن جائے اور پھر اس کو وہاں کے مشہور
 و معروف گرجا پر چڑھنے کا موقع حاصل ہو؟ کیا غالب کو اپنی
 اس زندگی میں کبھی عرش کے آستانہ تک بھی رسائی
 ہوئی؟

جنزنام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
 جنہ وہم نہیں صورتِ اشیا ہرے آگے
 کیا اس میں کوئی نئی بات پائی جاتی ہے؟ کسی ہندوستانی
 جو گئی فقیر سے ملنے تو وہ بھی اسی قسم کی بیہوشی روٹوں سے آپ
 کو محفوظ کرے گا۔

ایک کھیل ہے اور رنگ سلہاں میرے نزدیک
 اک بات ہے اعجازِ میا میرے آگے
 اس شعر میں تعلق کے سوا اور کسار کھا ہے؟
 اب صوفیانہ رنگ کا ایک شعر لیجئے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبو یا مجھ کو بولے نہ ہنریا میں تو کیا ہوتا
 یہاں لفظی بازی گری لے سوا اور نیا ہے۔ صوفی اپنے عقائد کی
 کوئی بات اس میں نہیں پاتا اور نہ منطقی کے لئے اس میں کوئی
 منطوق ہے۔

اس نوعیت کی مثالیں کثرت کے ساتھ دی جاسکتی ہیں ان
 سے صرف یہی ظاہر ہو گا کہ غالب کے معصوم پرستار اس کی
 شاعری سے نہیں بلکہ اس کے مفروضہ فلسفہ اور قدرت
 الفاظ سے متاثر ہوئے۔

جب تک غالب کے رسمی اور اصلی اشعار میں امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ حقیقی شاعر پر ہمیشہ نقاب پڑی رہے گی ایک رسمی پہلو نے سخن پر کتنا ہی عقلی رنگ چڑھایا جائے وہ زیادہ سے زیادہ ایک عقلی پہلو بن سکے گا۔ کوئی فلسفیانہ خیال خواہ وہ نظم ہی میں ظاہر کیا گیا ہو، بہر حال فلسفیانہ خیال ہے۔ اگر رسمی طرز اور فلسفہ شاعرانہ تجربہ سے شیر و شکر ہو کر زور پیدا کرتا چاہتے ہیں تو ان دونوں کو اس تجربہ کا پابند رہنا ہو گا نہ کہ اٹے اپنی گرانی سے اس کو بوجھل کر دیا جائے۔

شاعرانہ سخن کا یہ ایک ابتدائی نکتہ ہے جس سے غالب کے اندھے پرستار و اوقت نہیں معلوم ہوتے سخن کے عقلی پہلو (جو رسمی طرز اور خصوصاً اس مہیہ ان میں ظاہر کئے گئے جس کو حاتی عام طور پر شاعر کے فلسفہ اور حکمت سے تعبیر کرتے ہیں) اور اس کی ہمتا اظہار ان دونوں نے اس کے پرستاروں کے دلوں کو اس قدر موہ لیا کہ وہ اس امر پر غور و تامل ہی نہیں کرتے کہ وہ کسی فلسفی یا لفظی صنعت گر سے بحث کر رہے ہیں یا کسی شاعر سے۔ غالب کی لفظی صنعت گری بلاشبہ لایق قدر ہے۔ اگرچہ اس پر قدرت حاصل کرنے کے لئے بھی اس کو فاصعہ لگا۔ جیسا کہ اس کے

دیوان سے جس کو راقم الحروف نے تاریخ و ادب مرتب کیا، ظاہر ہے۔

اس کا فلسفہ کیا ہے اور وہ کہاں ہے؟ ہر شخص مذہبی فرض کی طرح ادھر ادھر سے رسمی طرز کے شعر چن لیتا ہے۔ پھر ان کی تشریح و تفسیر کرتا اور ہر شعر میں کوئی نہ کوئی فلسفیانہ خیال پاتا ہے لیکن اب تک کسی نے بھی مختلف خیالات کو جوڑ کر کوئی نظام پیش کرنے کی کوشش نہیں کی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ غالب نے آخر فلسفہ کی کیا خاص خدمت انجام دی ہے غالب کا مطالعہ دراصل ایک شاعر کی حیثیت سے ہونا چاہئے۔ اس کا اپنا زندگی کے متعلق کوئی زاویہ نگاہ یا بہ الفاظ دیگر فلسفہ حیات ہو گا جس نے اس کے شاعرانہ تجربہ پر رنگ آمیزی یا اس میں گہرائی پیدا کی ہو گی اگر اس کی تحقیق کرنی ہو تو ان اشعار کو نظر انداز کرنا ہو گا جو رسمی طرز میں عقلی پہلو رکھتے ہیں اور اس کلام کو دیکھنا ہو گا۔ جس میں اس کی اپنی زندگی کی محسوس کی ہوئی چیزیں ایک مستقل راگ اختیار کر لیتے ہیں۔

غالب کے نماد یہ نگاہ یا اس کے فلسفہ حیات والے باب میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ شاعر کی روح یا ذہن جس انداز نگاہ سے

متاثر ہوئی وہ بے اطمینانی کی پیداوار ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی آس پاس کی دنیا کو مخالفانہ اور اجنبی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔ غالب کا حقیقی فلسفہ حیات، دراصل اسی ماندازنگاہ میں مل سکتا ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جس نے اس کے شاعرانہ تجربہ سے نکل مل کر اس کے شاعرانہ اظہار میں ایک امتیازی رنگ پیدا کر دیا۔

کسی شخص کے شاعرانہ تجربہ سے مراد جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے، وہ چیز ہے جس سے وہ شاعرانہ طور پر اپنے ذہن میں لطف اندوز ہوتا ہے یہ لطف اندوزی اس کے باطنی قید و بند کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے کیونکہ جیسا ذہن ہوگا ویسا ہی اظہار ہوگا۔ اور جیسا کہ ہم اگلے باب میں بیان کر آئے ہیں۔ ذہن انسانی انتہائی بلندی اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب کہ وہ زندگی میں ”ہم آہنگی“ کو پائے۔ پر عظمت شاعری ایسے ہی ذہن میں جنم لیتی ہے اس وقت شاعر یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ زندگی ہم آہنگی کا منظر ہے اور اس کا ذہن خارجی دنیا سے مطابقت پیدا کرنے لگتا ہے۔ یہ ہم آہنگی غالب کو کبھی حاصل نہیں ہوئی۔

جب کوئی شخص اپنے ذہن کو خارجی دنیا سے مطابق کرنے

میں ناکام ہوتا ہے تو وہ دو باتوں میں سے کوئی ایک بات اختیار کر لیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ محبوط الحواس نہ بن جائے بلکہ تسکین حاصل کرنے اور اپنی پریشان روح کو آرام پہنچانے کا آرزو مند ہو۔ وہ یا تجھے تماشاً یا چمکے چمکے اپنے آپ کو ایسی ہستی کی آغوش میں دے دیتا ہے جو اس کی آتش محبت کو بھڑکائے۔ اور خود بھی اس آگ میں چلنے لگے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے محبوب کے سوا دنیا میں کوئی چیز اس کی دل چسپیوں کا مرکز نہیں بن سکتی یا اگر ایسا نہ ہو سکے تو وہ دنیا کی ہر چیز سے منہ پھیر لیتا ہے اور ایک خود ساختہ ذہنی زندگی بسر کرنے لگتا ہے جس میں وہ ایک ایسی ہم آہنگی کو مسلط کر لیتا ہے جو اس کی خیال آرائی کو بھلی معلوم ہو۔

”اے دوست آ کہ ہم آپس میں صدق و وفا کی زندگی بسر کریں یہ دنیا جو بھانت بھانت کے جمیل اور نت نئے خوابوں کی سر زمین کی طرح ہمارے سامنے ہے، حقیقی خوشی، لطف و محبت اور توردتجلی کا کوئی تحفہ ہمارے لئے نہیں رکھتی اور نہ اس میں ایقان و اطمینان کا کوئی سامان اور دردِ دل کی کوئی دوا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک گھٹا ٹوپ میدان میں ہیں۔“

جو رزم و پیکار کی پریشان دہشتوں سے معمور ہے۔ جہاں
بے خبر فوجیں رات کی تاریکی میں ایک دوسرے سے ٹکرا
جاتی ہیں۔»

اس طرح سے بعض لوگ اپنی تسکین کا سامان کرنے ہیں
محبت کی بارگاہ میں وہ اپنی زندگی کے تمام مصائب کو بھلا دیتے
ہیں۔ یہی ان کا درمان ہے۔

غالب کو یہ تسکین کبھی نصیب نہ ہوئی۔ شباب کے عالم میں
اس کو ایک عورت سے لگاؤ ضرور پیدا ہوا جو شاید بازاری تھی۔
لیکن یہ لگاؤ ابھی ۱۰ الفت کا رنگ «پکڑنے نہ پایا تھا کہ وہ اس
جہان سے رخصت ہو گئی اور غالب نے غزل کی صورت میں ذیل
کا دل گزارہ مرثیہ لکھا۔ یہ ساخنہ اس وقت پیش آیا جب کہ غالب
کی منکوہ بیوی موجود تھیں اور ان کی شادی کو کوئی زیادہ
عرصہ نہ گزرا تھا۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم کساری ہائے ہائے

کیوں میری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
 دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے
 عمر بھر کا تونے پہیان وفا باندھا تو کیا؟
 عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
 زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
 یعنی تجھ سے تھی اسے تا سا نگاری ہائے ہائے
 گل نشانی ہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا
 خاک پر ہوتی ہے تیری لالکاری ہائے ہائے
 شرم رسوائی سے جا چھپتا نقاب خاک میں
 ختم ہے الفت کی تجھ یہ پردہ داری ہائے ہائے
 خاک میں ناموس بہمان محبت مل گئی
 اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے
 ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
 دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے
 کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تار بزننگال
 ہے نظر خود کردہ اختر شمار ی ہائے ہائے

گوش مجبورہ پیام و چشم محروم جمال
 ایک دل تیس سپرہ یہ نا امید داری ہائے ہائے
 عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی الفت کا رنگ
 رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے
 اس کے کئی سال کے بعد اس نے یہ اشعار لکھے :-

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشین ایک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے
 وہ مہرہ زارہ ہائے سطر کہ ہے غضب وہ نازنین تباں خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آند مادہ ان کی نگاہیں کہ حرفِ نظر

طاقت زیادہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

ان سے کسی اور جراثیمت دل کی بو آتی ہے یہ واردات
 ظاہر ہے کہ چالیسواں سال کلکتہ کے سفر میں پیش
 آئی ۔

اس کے ابتدائی سانچہ اور کلکتہ کی یاد دروانِ گیز کے درمیانی
 عہد میں بھی غالب کچھ خاموشی نظر نہیں آتا۔ اس کی غزل
 جس کا مطلع یہ ہے ۷

مدت ہوئی ہے یار کہ کہاں کئے ہوئے

جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے

اور جو کلکتہ کے سفر سے کئی سال قبل لکھی گئی کچھ معنی اپنے اندر ضرور رکھتی ہے۔ بشرطیکہ وہ صرف ذہنی مشق کا نتیجہ نہ ہو۔

سفر کلکتہ کے بعد اس پر کیا گزری یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا ممکن ہے کہ اس نے محبت کی مشق، ڈھلتی ہوئی عمر کے تناسب سے جاری رکھی ہو۔ لیکن اس ڈھلتی چھاؤں میں عشق بازی کے کوئی قطعی اور تاریخی نشان ہمیں نہیں ملتے۔ بہر حال عشق و محبت کی پہلی سرگزشت کے بعد بھی اس نے شاعرانہ طبع آزمائی کی۔ بلکہ وفات کے چند ہی سال پہلے ساٹھ سال کی عمر میں اس نے شعر کہے ہیں۔

ملاحظہ ہو :-

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجب آرام جان و تن تکیہ
بنا ہے تختہ گل ہائے یا سمیں بستر
ہوا ہے دستہ نسرین و نستر تکیہ
فردغِ حسن سے روشن ہے خواب گاہ تمام
جو رختِ خواب ہے پر ویں زہریں تکیہ

مزاملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
 رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سپہن تکیہ
 اگرچہ تقاہیر ارادہ مگر خدا کا شکر
 اٹھا سکانہ نزاکت سے گل بدن تکیہ

اگر یہ اشعار بڑھاپے میں لکھے گئے جب کہ غالب اپنے
 بستر سے بمشکل حرکت کر سکتا تھا تو یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا
 ہے کہ اس کی یہ شاید انہ محبت حقیقی اور چلتے جاگتے جذبات
 عشق سے معرّی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف ذہنی مشق کا نتیجہ
 ہے۔ اگرچہ ایک مقامی مضمون نگار نے رسالہ اردو اور رنگ آباد
 میں ایک دل چپ نظر یہ یہ پیش کیا ہے کہ غالب نے
 جوانی میں ایک فلسفی کی حیثیت سے زندگی شروع کی اور
 انسانی عقل و فہم سے بالاتر علم و حکمت کی باتیں سمجھائیں
 لیکن بڑھاپے کے آخری ایام میں اپنے محبوب اور اپنے
 ناتواں پوست و استخوان کے درمیان سے تکیہ ہٹانے
 کی کوشش کرتا رہا۔

غرض جو بھی حقیقت ہو اور غالب کی حقیقی زندگی میں
 اس کے عشق و محبت کا جیسا بھی رنگ جھلکتا ہو اس کا محبوب

جس کو وہ اپنی غزلوں میں جلوہ گر کرتا ہے ایک رسمی معشوق
بلکہ ناقابل ذکر شاید بازاری ہے۔

بغل میں خیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سب کیا خواب میں آکر بستم ہائے پنہاں کا

شب کو کسی کے خواب میں آیا ہے وہ کہیں
وُکھتے ہیں آج اس بُتِ سمیں بدن کے پاؤں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کی بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئے غیر سے تھی
سُن کے ستمِ ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

یہی ہے آتنا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
غدو کے ہونے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی

بجا کہتے ہو بیچ کہتے ہو پھر کہتے کہ ہاں کیوں ہو

غیر پھر تا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربط نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہئے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
یس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

اس سے سرسرمی طور پر غالب کی اس محبت کا تصور ہو سکتا ہے (تا وقتیکہ اس کے خلاف ہمیں کوئی شہادت دستیاب نہ ہو) جو اس کی ذہنی گل گشت اور سچ مح ماد می معاملات میں ظاہر ہوتی رہی۔ اس کی محبت صاف طور پر مادی قسم کی ہے اور اس میں کوئی روحانیت نہیں پائی جاتی۔ ایسی محبت جو پتہ مردگی کے عالم میں جان پروری کرتی اور مکروہات زندگی کو دل سے محو کر دیتی ہے، غالب کے مکمل دیوان میں اس کے کوئی نشان نہیں ملتے۔

وہ لوگ جو اس قسم کی جان پرور محبت سے نا آشنا ہیں اس ناقابل فہم دنیا کے حقائق سے بظاہر اپنے آپ کو بے تعلق کر کے کوئی اور راستہ اختیار کر لیتے ہیں وہ پھر اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنی ایک الگ دنیا میں باطنی طور پر گھومتے رہیں۔ اپنے ذہنی چین کے لئے وہ "پروٹھیسیس ان بونڈ" "ڈیٹاٹس" اور اسی قسم کی شاعرانہ تخلیق عمل میں لاتے ہیں۔ اپنے ان اقلیموں میں وہ اس ہم آہنگی کو پالتے ہیں جو انسانوں کی بستی میں انہیں نصیب

نہ ہوئی تھی۔

ایسی شاعری جس میں پناہ گزینہ کا یہ اندازہ پایا جاتا ہے، گزینہ شاعری کے نام سے یاد کی جاتی ہے اس کو انسان کی روزمرہ معمولی زندگی سے واسطہ نہیں ہوتا اور اس لحاظ سے اس پر زندگی کے عالم گیر پہلو کی کوئی چھینٹ نہیں پڑتی۔ خواہ وہ کیسے ہی حسین و جمیل تخمیل کی حامل ہو۔ اور ذہن انسانی پر اس کا اثر کتنا ہی قوی اور طاقتور ہو، اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ ایک خیالی چیز اور تخمیل کی مخلوق ہے۔ اسی لئے وہ ان لوگوں کی تسکین دل نہیں کر سکتی جو مصائب کے عذاب میں زندگی بسر کرتے ہیں اس قسم کی شاعری سے ہمیں مسرت ضرور حاصل ہوتی ہے لیکن وہ ہمارے شکوک اور انتشارات کو دور نہیں کر سکتی۔ وہ ہمارے ذہن کو خارجی دنیا سے مطابق نہیں کرتی اور اشیاء عالم کو صحیح تناسب سے دیکھنے کی کوئی صورت ہمارے لئے نہیں نکالتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس شاعری کو جو زندگی کی تعبیر کرتی ہے اور جس کو تعبیری شاعری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے پناہ گزینہ

شاعری سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اس تعبیری شاعری میں انسان
 نہ تو زندگی سے بھاگتا ہے اور نہ اس کو اس کے جوڑ و ستم کے
 شکار ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس شاعری میں لذت
 و آواز، مسرت و غم اور وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جو زندگی
 سے وابستہ ہیں۔ یہ چیزیں اپنے طور پر ہماری زندگی میں داخل
 ہوتی ہیں اور باطنی قوت ہم آہنگی جو تعبیر کا منشاء ہے ہمیں
 ان کا احساس کراتی ہے شاعر ان کی معانی کو کھول کر رکھ دیتا
 ہے جس قدر اس کے سارے تجربات جو بالاتر ایک جامع تجربہ
 میں سما جاتے ہیں، وسیع اور مختلف النوع ہونگے اسی قدر
 ان کے مجموعی معانی کی ہم آہنگی بڑی ہوئی ہوگی۔ اسی طرح
 جس قدر بھی ان معانی کی صورت انظار اور ان کا پیدا کردہ
 یا حاصل شدہ احساس وحدت بڑا ہوگا، شاعری بھی بڑے
 درجہ کی ہوگی۔

غالب نے یہ عظمت کبھی حاصل نہیں کی۔ اس کے لئے
 خود غالب ہی مورد الزام ہے۔ عظمت اس میں موجود تھی
 لیکن اس نے اپنی خود سری اور زندگی کے تنگ زاویہ نظر سے
 اس عظمت کو کچھ ڈالا۔ اس کی بے اطمینانی خود اس بات

کی منظر ہے کہ وہ دنیا کو سمجھنے، زندگی کو پرتال نہ، اور کائنات کی محبوب چیزوں کو تاڑنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا۔ چار دیواری میں محصور، اوروں سے بے خبر، صرف اپنے حاجت راؤوں پر نظر جائے، اور کبھی کبھی روحانی دانشمندی کی جھلک دکھاتے ہوئے، اس نے اس دنیا میں زندگی بسر کی، ایسی دنیا میں جو شاعرانہ پیداوار ہو اس میں کوئی ربانی تجلی اور الہی عظمت کے عناصر مشکل سے پائے جاتے ہیں۔ غرض روحانی ہم آہنگی غالب میں سرے سے لاپتہ ہے۔

اگر وہ ہم آہنگی اس کو حاصل بھی ہو جاتی جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، یہ بات ناممکن تھی کہ غزل جیسی ننھی صنف میں ایک بڑے شاعر کا بڑا تجربہ پوری وسعت بوقلمونی اور جامع معانی کے ساتھ ظاہر ہو سکتا۔

اگر یہ ہم آہنگی اس کے حصہ میں نہ آئی تو کوئی بات نہ تھی کافی ایقان کے ساتھ اگر وہ ایک سچی پناہ گاہ تلاش کرتا اور اپنی بنائی ہوئی مثالی دنیا میں پناہ گزیر ہو جاتا تو پھر بھی شاعرانہ عظمت اس کو حاصل ہو جاتی

گودہ بہت ہی بلند پایہ نہ ہوتی۔ لیکن اس خصوص میں اس کی انتہائی پرواز کا حاصل یہ ہے۔

رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے درد دیوار سا ایک گھر بنایا جائے
کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گھر بیمار تو کوئی نہ ہو تیسرا دار
اور اگر مر جائے تو لوحہ خواں کوئی نہ ہو
یہ ایک دیوانہ کی بہشت ہے۔

اب یہ دیکھتا ہے کہ ہمارے ذہن میں اس کی کون سی تصویر جلوہ گرہ ہوتی ہے۔ بہ حیثیت ایک لفظی صنعت گر کے غالب تمام اردو غزل گو شعرا میں ایک بلند مرتبہ پر فائز نظر آتا ہے۔ اگرچہ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں، اس چیز پر قدرت حاصل کرنے کیلئے بھی اس کو کافی عرصہ لگا۔ اس قدرت زبان کے نمونے اس کی نثر یعنی مکاتیب میں جو پختگی عمر کے نتائج ہیں اس لحاظ سے اس کو اردو نثر کے خانہ سازوں میں شمار کیا

جاسکتا ہے۔ لیکن بحیثیت شاعر کے وہ بتلائے فریب
 رہا۔ اس کی شاعرانہ پیداوار میں نہ تو وہ محبت ہے
 جو حیات آفریں ہوتی ہے نہ وہ ہم آہنگی جو حقائق سے
 پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ ہم آہنگی جو پناہ گزینی کے
 احساس سے ظہور پذیر ہوتی ہے ایک نئے ستارے کی
 آن میں چمکنے کی آرزو میں وہ اپنے حقیقی منصب کو
 بھلا بیٹھا، اس رہنمائی تجلی کو جو بہ حیثیت شاعر کے
 اس کو عطا کی گئی تھی اس نے اپنے ہاتھ سے دے دیا
 باوجود اس کے یہ تجلی اس سے واصل رہنے کی
 فیاضانہ کشمکش میں مبتلا نظر آتی ہے اسی لئے اس
 کے اردو کلام میں کبھی کبھی اعلیٰ ساعتوں کا سراغ
 بھی ملتا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
 خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ نہاں ہو گئیں

قفس میں مجھ سے روئداد چمن کہتے نہ ڈرہدم
 گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا اشیا کیوں ہو

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

آگے آتی تھی حال دل پہ ہسنی
اب کسی بات پر نہیں آتی

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گرمی کس کی ہے
پہرہ چھوڑا ہے کچھ ایسا کہ اٹھائے نہ بنے

لہر زتا ہے مراد دل زحمت مہر درختاں پر
میں ہوں وہ قطرہِ شبنم جو ہو تار یا یاں نہیا

رنج سے خوگر ہو انسان تو مٹ جاتا رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ بہاری جناب میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہ روکے ساتھ
 پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
 ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا
 لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
 جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کہاں کیا

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پودہ سادہ
 ہوں میں اپنی شکست کی آواز

لیکن ایسی گھڑیاں کبھی کسی بڑی نظم کی صورت
 میں ظاہر نہیں ہوتیں اور نہ ان کے اعلیٰ سر اعلیٰ نغمہ
 بن سکے۔ کیونکہ اس نے وہ احساس ہم آہنگی کبھی محسوس
 نہ کیا جو ایک بڑے شاعر کے لئے ضروری ہے اور نہ وہ
 زاویہ نگاہ پرورش کر سکا جو ایک بڑے شاعرانہ
 تجربہ کو ایک بڑی نظم میں ڈھالتا ہے۔

یہ ہے کہانی ہمارے شاعر کی - اس نے ایک
 منتشر اور یہ نگاہ کے سایہ میں منتشر زندگی بسر کی اور
 ہمارے لئے ایسی شاعری چھوڑی جو خود ہم آہنگی
 سے معرا ہے - اس کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں
 ہو سکتا -



ضمیمہ

(۱)

اردو دیوانِ غالب کی تاریخی ترتیب کے سلسلہ میں حسب
ذیل مکتوب سر اکبر حیدری نواب حمید ر لو آ از جنگ بہادر صدر
المہار رفینائنس حکومت نظام نے از راہ کرم ڈاکٹر ولی محمد
معتد ریاست بھوپال کی خدمت میں میرے لئے تحریر
فرمایا تھا۔

ڈیرہ مسٹر ولی محمد!

ڈاکٹر سید عبد الطیف، پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

غالب پر ایک کتاب تصنیف کر رہے ہیں۔ کلام غالب کی تحقیق کے سلسلہ میں وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کون کون سے اشعار یا نظموں میں دیوان غالب کے اس اصل نسخے (۳۳۷) کے حاشیہ بہ درج ہیں جو کتب خانہ حمید یہ میں محفوظ ہے۔

میں اس حظ کے ساتھ دیوان غالب کا ایک نسخہ جو مفید عام پریس سے نسخہ حمید یہ کے نام سے شائع ہوا ہے روانہ کر رہا ہوں۔ اگر آپ اذراہ کرم اس نسخہ میں ان اشعار یا نظموں پر نشان لگا دیں جو اصل مسودے کے حاشیہ سے لئے گئے ہیں تو ڈاکٹر لطیف کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب ان لوگوں کے پورے نام بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں جو اس نسخہ اور اصل مسودے کا مقابلہ کر کے متعلقہ اشعار اور نظموں پر نشان لگانے کی زحمت گوارا کریں۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب کی تصنیف مکمل ہو چکی ہے اور وہ اس کی طباعت سے قبل دو ایک باتیں صاف

کر لینا چاہتے ہیں اس لئے براہ کرم مرسلہ نسخہ، دیوان بہ عجلت ممکنہ، کوئی ایک ہفتہ میں واپس روانہ کر کے مجھے ممنون فرمائیے۔ امید کہ آپ یہ زحمت گوارا فرمائیں گے۔

مخلص

(شرح دستخط) اے۔ حمیدری

اسی قسم کا ایک اور خط مولانا نظامی (صوبہ متحدہ) کی خدمت میں روانہ کیا گیا تھا۔ جنہوں نے دیوان غالب مطبوعہ نظامی پریس بدایون کے دوسرے ایڈیشن میں یہ بیان فرمایا ہے کہ ^{۱۹۲۸} نسخہ میں دیوان کا جو سودہ خود غالب نے ترتیب دیا تھا، وہ بدایونی نسخہ کی ترتیب کے وقت صاحب موصوف کے پاس موجود تھا۔ ان سے یہ استدعا کی گئی تھی کہ نسخہ حمید یہ کے ایک نسخہ پر ان اشعار یا غزلوں پر نشان لگا دیں جو غالب کے مرتبہ مسودہ میں بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر ولی محمد نے تو اصل نسخہ میرے ذاتی مطالعہ اور تحقیق کے لئے روانہ فرما دیا لیکن

مولانا نظامی بدایونی نے سر اکبر حیدری کے مکتوب کے جواب میں ایک خط روانہ فرمایا جس کی نقل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ایڈیٹر ذوالقرنین
۳ دسمبر ۱۹۲۷ء

نظامی پریس
بدایون۔ یوپی

مکرم و محترم بندہ تسلیم

مجھے ندامت ہے کہ میں تعمیل ارشاد نہ کر سکا اور کتاب کو بجنسہ واپس کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قلمی دیوان جو ۱۹۲۸ء کے قریب کالکھا ہوا مجھے ۱۹۱۸ء میں ملا تھا اور جس کا ذکر میں نے اپنے یہاں کے مطبوعہ دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن میں کیا ہے وہ اس وقت میرے پاس موجود نہ تھا۔ بلکہ ایک مرحوم دوست (منشی احمد علی صاحب شوق) کے ذریعہ سے مجھے رام پور میں دستیاب ہوا تھا۔ جس سے میں نے اس وقت کام لیا تھا۔ میں نے ۷ نومبر کو جو عرضیہ

بھیجا تھا اور جس میں میں نے یہ تحریر کیا تھا کہ اس کام کے لئے وقت کی ضرورت ہے اس وقت مجھے خیال تھا بلکہ امید تھی کہ رام پور میں یہ نسخہ مل جائے گا اور اس سے میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کر سکوں گا۔ چنانچہ میں ۱۷ نومبر کو رام پور گیا۔ اور وہاں ۲۰ تک مقام گیا اور اس درمیان میں ہر امکانی کوشش نسخہ مذکور کے لئے کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ کتب خانہ رام پور میں بھی یہ نسخہ موجود نہیں بلکہ وہاں ایک نسخہ قلمی ضرور ہے جو ۱۵۵۵ء (۱۱۵۵ھ) کا لکھا ہوا ہے۔ مجھے خیال تھا کہ منشی احمد علی صاحب شوق نے جن کا تعلق کتب خانہ سرکار رام پور سے تھا۔ مجھے نسخہ (۱۲۴۸ء) کتب خانہ مذکور سے لیکر دیا ہو گا لیکن وہاں نہ ملا۔ اب منشی صاحب کا انتقال ہو گیا اس لئے میں اس کے حصول سے مجبور رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسخہ ان کا ذاتی تھا یا کسی اور دوست سے لے کر مجھے دیا تھا۔

والسلام

نیا زمند
نظامی بدایونی عفی عنہ

نسخہ حمید یہ جب بدایون سے حیدرآباد واپس فرمایا
 گیا تو اس میں کئی اشعار اور بعض جگہ مصرعے بھی شرح
 پنسل سے نمایاں طور پر نشان زدہ تھے۔ یہ نہ معلوم ہوسکا
 کہ یہ نشان کس نے لگائے لیکن (۱۲۴۸ء) کے نسخہ کی عدم
 موجودگی میں یہ نشان خواہ وہ کسی کے لگائے ہوئے ہوں
 الہامی چیز معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ ان سے اکثر جگہ
 ردیف الفت کی غزلوں میں میری تاریخی ترتیب کی تائید
 و تصدیق ہوتی ہے کلام غالب کے محققین ان معلومات کی
 روشنی میں اس نسخہ کی تلاش کر سکتے ہیں۔ اس کی دستیابی
 سے مطالعہ غالب کے کئی مسائل کے حل میں مدد ملے گی۔



ضمیمہ

(۲)

ذیل میں غالب کی اس تحریر کا اقتباس دیا جاتا ہے جس کا ذکر صفحہ (۷۸) کے فٹ نوٹ میں کیا گیا ہے :-

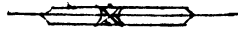
گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے، اشرفیوں کے عوض قصیدہ مدح نذر دیتا ہے اور سات پارچہ چمچہ سر بیچ موٹیوں کے ماے خلعت پاتا ہے۔ اب کی بار جو لاہور میں لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے دربار داروں

کے فہرست کے صاحب کمشنر بہا در حصار نے کہ در نیولا
 قائم مقام صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں مثلاً ور رئیسوں کے
 اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا۔ بیچارہ
 بہ سبب ہتی دستی اور بے مقدر تہی کے لاہور نہ جاسکا مجھ
 سے کہتا تھا کہ شکر بہس کا آدمی کانوں سے بہرا ہوں
 اور اکثر بیمار رہتا ہوں۔ لیکن اگر میرے پاس روپیہ
 ہوتا تو میں ان عوارض کو نہ مانتا اور بے شک لارڈ
 صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا، خیر آخر عمر میں یہ
 ایک داغ حسرت رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا
 خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے، اس شخص
 نے ۱۸۵۵ء کے آخر میں قصیدہ مدح ملکہ معظمہ ولایت
 کو بہ سبیل ڈاک لارڈ الن بورا گورنر نہ سابق کی معرفت
 بھیجا ہے اور اوائل ۱۸۵۶ء میں تین خط انگریزی
 بواسطہ انڈیا گورنمنٹ ولایت سے اس کو ڈاک
 میں آئے ہیں۔ اب ہم ان تینوں خطوط کے خلاصے
 لکھ کر اس کے ذکر کو ختم کرتے ہیں۔

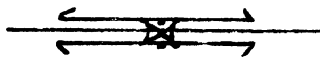
مذکورہ بالا تخریروں پر مدیر رسالہ اردو اورنگ آباد

نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ان حالات کے پڑھنے سے کم از کم ایک بات تو پکی ہوتی ہے اگرچہ ان کے کلام اور رقعات میں بھی بابجا اس کا ذکر آچکا ہے اور ایک صاحب نے جو مرزا صاحب کی حب وطن اور قوم کی نسبت (جدید خیالات کی رو سے) جو حسن ظن قائم کیا تھا۔ اس کی تردید خود مرزا صاحب کے الفاظ سے ہو جاتی ہے۔



مصطفیٰ ذوالشبیفة ۲۰۱۳ھ	وید	۳	ھ	(گنہگاروں کے لئے)
۲۰	ورس	۴	گرگوبال ۲۰۱۳ھ	۱۰۶۹۱۴۱۵۷۳
ن	ورس	۴	گویند سہانے ۲۳	۱۰۵۱۴۵
نبی بخش ہفتی ۲۰۱۳ھ	وشنو	۱۱۱	میکل ۵۰۱۴	یوسف علی خاں نواب
تیر	دیکھو فیما بین خاں والیس	۴	ہرشل ۴	۱۶
تفیری ۱۰۵۷۴۱۳۴۱۰	واہراں	۴	میر سنگہ ہفتی ۲۲، ۲۳	یوسف مرزا
۵۷	ورد سورگھ ۱۱۱۵۱۱	۸	نہد ستال ۱۵، ۱۶، ۱۷	۲۳، ۲۱، ۳۹
د	دیلی	۵۱	ی	۱۰۶۹۱۴۱۵۷۳
۷۹	دخشت	۷۰	یادگار دیکھو یادگار غالب	تمت



کلیات اقبال

علامہ اقبال علیہ الرحمہ کا کلام ادبی دنیا میں خصوصیت کے ساتھ بہت اونچا مقام رکھتا ہے اس کے علاوہ ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ الہام ربّانی کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتا ہے ان کا تمام اردو کلام ظاہری و باطنی محاسن کے ساتھ یکجا جمع کر کے شائع کیا گیا ہے۔ صحت و خصوصیت انتظام کیا گیا ہے۔ کتابت و طباعت بہترین،

مجلد مع گرد پوش قیمت

پانچ روپے (۵)

افضل الشواہد

حضرت سلطان المشائخ محبوب الہی خواجہ نظام الدین اولیاء
 رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات مرتبہ امیر الشعراء، امیر خسرو دہلوی نے حضرت
 والا کی حیات طیبہ میں زبان فارسی میں قلم بند کئے تھے ان ملفوظات
 کو حضور محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ نے خود قلم بند ہونے کے بعد مطالعہ
 فرمایا اور درست پایا اس لئے اس شریعت و طریقت کے مجموعہ کو
 (جو عرصہ سے ناپید تھا) بزبان اردو شائع کیا گیا ہے تاکہ اس کتاب
 سے زیادہ سے زیادہ حضرات فائدہ اٹھا کر اپنی عاقبت درست کریں۔
 اس کتاب کے دو حصے ہیں ہر دو حصص پوری احتیاط اور
 جمیع محاسن کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں۔ ہدیہ ہر دو حصص
 جلد معہ گرد پوش پانچ روپے (۵)

جذباتِ فطرت

مرتبہ :- پروفیسر محمد الیاس - بہرائی

اردو منظومات کا یہ خوبصورت مجموعہ جس کے انتخاب کا شرف الیاس بہرائی جیسی نامور شخصیت کو حاصل ہے اپنی افادگی حیثیت عام طور پر مسلمہ رکھتا ہے اردو منظومات کی اس قدر اعلیٰ تہمت جس سے زبانِ اردو کی جواہر نہینہ می کا اندازہ ہوتا ہے۔ کم دیکھنے میں آئی ہوگی۔ ڈھائی سو صفحات کا یہ مجموعہ بلند پایہ اعلیٰ ترین منظومات کا جاذبِ نظر مرقع ہے جو اردو ادب میں ایک بہترین شاہکار ہے۔ ظاہری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ قیمت

چار روپے (لگہ)

ادب عالیہ

اردو منظومات کا عدیم النظیر نچوڑ جس سے اردو ادب کے بلند معیار کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ پروفیسر محمد الیاس برہانی نے مرتب کیا ہے۔ ایک ایک شعر اپنی خوبصورتی اور محاسن کے لحاظ سے ادنیٰ تکینہ معلوم ہوتا ہے۔ اردو ادب کا یہ شاہکار جذباتِ فطرت کا حصہ سوم و چہارم قیمت ہر دو حصص چار روپے۔

کلیاتِ اختر شیرانی

شاعرِ رومان اختر شیرانی مرحوم شعر کی دنیا میں ایک پیغمبری حیثیت رکھتے ہیں ان کے کلام کو یک جا جمع کر کے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ ایک جلد میں شایع کیا گیا ہے۔ کتاب اردو شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

قیمت مجلد مع گرد و پوش اکٹھ روپے (مع)

